

باسمہ تعالیٰ

سروری زیرِ فقط اُس ذاتِ بے ہمتا کو ہے  
حکمران ہے اک وہی 'باقی بستانِ آفری'

# آزادی کا قرآنی مفہوم

.....

یومِ آزادی۔ اگست ۱۹۷۹ء پر خطاب

پرویز

# آزادی کا قرآنی مفہوم

غیر متقسم ہندوستان میں کانگریس (یعنی ہندو) باریاد (تحریک پاکستان کے سربراہ) قائد اعظم سے کہتے تھے کہ جب ہمارا مقصد بھی حصول آزادی ہے اور آپ کا مقصد بھی وہی تو آپ کو ایک الگ تنظیم قائم کرنے اور جداگانہ تحریک چلانے کی ضرورت کیا ہے؟ آپ ہمارے ساتھ شامل ہو جائیے۔ ہم دونوں مل کر، انگریز کو یہاں سے نکال کر آزادی حاصل کر لیں گے اور نظام جمہوریت کی رو سے عوام کی حکومت قائم کریں گے جس میں تمام باشندگان ملک کو یکساں آزادی حاصل ہوگی۔ اس کے جواب میں (پہلے علامہ اقبال اور ان کے بعد) قائد اعظم ان سے کہتے تھے کہ لفظ طور پر تو آپ ٹھیک کہتے ہیں، لیکن جہاں تک لفظ آزادی کے مفہوم کا تعلق ہے، وہ آپ کے اور ہمارے نزدیک ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہے۔ آپ کے نزدیک آزادی سے مفہوم یہ ہے کہ انگریز یہاں سے چلا جائے اور اہل ہند اپنی حکومت آپ قائم کر لیں۔ لیکن ہمارے نزدیک آزادی کا مفہوم مقصود اس سے مختلف ہے۔ اور وہ مقصد حاصل نہیں ہو سکتا جب تک مسلمانوں کی اپنی آزاد مملکت قائم نہ ہو جائے۔ (بالفاظ دیگر) وہ ان سے کہتے تھے کہ تمہارا یہ نزدیک آزاد مملکت کا قیام مقصود بالذات ہے اور ہمارے نزدیک آزاد مملکت اس مقصد کے حصول کا ذریعہ ہے جو مسلمان کی زندگی کا مقصد ہے۔

یہ تھا تحریک پاکستان کے دوران کانگریس اور مسلم لیگ۔ یا ہندوؤں اور مسلمانوں کی باہمی کشمکش کا نقطہ تھیں۔ مسلمانوں کے نزدیک آزادی کا مفہوم کیا ہے؟ اس کی وضاحت کے لئے وہاں طلوع اسلام کا وجود عمل میں آیا۔ اس نے اس فریضہ کو کس جس خوبی اور کامیابی کے ساتھ ادا کیا، اس پر اس کے اُس زمانے کے فائل شاہد ہیں۔ قیام پاکستان کے بعد (نظرِ نظر) اس کشمکش کو ختم ہو جانا چاہیے تھا لیکن یہ فطرت کی ستم ظریفی یا ہمارے انتہائی بد نصیبی تھی کہ یہاں پہنچنے کے بعد یہ کشمکش اور بھی شدت اختیار کر گئی۔ یعنی یہاں آزادی سے وہی مفہوم لے لیا گیا جسے تحریک پاکستان کے دوران ہندو پیش کرتا تھا۔ یعنی مسلمانوں کی آزاد مملکت میں جمہوری نظام کا قیام۔ فرق صرف اتنا تھا کہ یہاں آئین کے برعکس خدا اور اسلام کے الفاظ چسپاں کر دیئے گئے، اسی طرح جس طرح ہم اپنے خطوط کی پیشانی پر بسم اللہ یا (۱۶) لکھ دیتے ہیں خواہ اس کے نیچے خط میں شراب کی دوا دہ نہ کی ہدایات ہی کیوں نہ درج ہوں۔

لہذا یہاں بھی طلوع اسلام نے یہ فریضہ اپنے ذمہ لیا کہ وہ بتائے کہ آزادی کا وہ مفہوم کیا تھا جس کے لئے اس خطہ زمین کو حاصل کیا گیا تھا۔ اس مقصد کے لئے پروفیسر صاحب گزشتہ تیس سال سے مسلسل مصروف جہاد ہیں۔ یوں تو طلوع اسلام کی کون سی اشاعت ہے جس میں بالواسطہ یا بلا واسطہ اس موضوع پر کچھ نہ لکھا جاتا ہو، لیکن خاص تقاریب بذریعہ یوم آزادی (۱۴ اگست) کی تقریب پر اس میں پروفیسر کے خصوصی مقالات یا خطابات اشاعت پذیر ہوئے ہیں۔ مثلاً ۱۹۷۱ء کے یوم آزادی کی تقریب کے سلسلہ میں جب ہم نے گزشتہ تقاریب کے خطابات پر ایک نظر ڈالی تو ہم نے دیکھا کہ انہوں نے ۱۹۷۱ء میں جو خطاب ارزانی فرمایا تھا (اور جس کا عنوان تھا — کیا ہم آزاد ہیں؟) وہ نہ صرف بڑا جامع اور نافع تھا بلکہ ایسا کہ وہ ملک کے موجودہ حالات میں بھی شیع قرآنی کام دے سکتا ہے۔ چنانچہ ہم نے مناسب سمجھا ہے کہ اس تقریب پر ان کی نظر ثانی کے بعد اسی کو ذریعہ اور اقی طلوع اسلام کر دیا جائے۔

واضح رہے کہ پروفیسر صاحب اپنے خطابات یا مقالات میں جو قرآنی حقائق پیش کرتے ہیں وہ کبھی پرانے یا (OUT OF DATE) نہیں ہوتے۔ البتہ ان کی تشریحات اور جزئیات، حالات کے بدلنے سے محتاج تغیر و تبدل ہو جاتی ہیں۔ یہی ان کی نظر ثانی سے مقصود ہوتا ہے۔

اس تہدید کے بعد ان کا خطاب ملاحظہ فرمائیے۔

ۛ

عسکریہ ان گامی قدر۔ سلام و رحمت  
 اگست ۱۹۷۱ء میں جب ہم نے اپنی آزادی کی پہلی سالگرہ منائی تو اس موضوع پر جو کچھ طلوع اسلام میں لکھا گیا تھا وہ آج بھی ہر سو پہنچنے والے ذہن کو اسی طرح دعوتِ غور و فکر دیتا ہے۔ اس میں کہا گیا تھا کہ انسانیت تاریخ کے اوراق پیچھے کواٹھنے جائے۔ کاغذ سے دھاتوں اور دھاتوں سے پتھروں، محلات بھونپڑیوں اور بھونپڑیوں سے غاروں تک کے از مد مسئلہ میں پہنچ جائیے۔ اس کی تہذیب کے نقشے بدلتے اور اس کے تمدن کے خاکے مختلف ہوتے چلے جائیں گے۔ زبانیں بدلیں گی، خیالات بدلیں گے۔ فرد بود و ماند بدے گا۔ مملوب و مقلد و گفتار بدے گا لیکن عصار و درجہ کے اس تقاد و تبائن اور اعصاب و دیار کے اس اختلاف و تنوع میں ایک شے ہر جگہ اور ہر مقام پر مشترک اور غیر متبدل نظر آئے گی اور وہ یہ کہ انسانی شعور نے جب سے آنکھ کھولی ہے اس نے ہمیشہ آزادی کی جدوجہد میں رہا ہوتی ہے۔ اس نے مختلف زمانوں میں مختلف خداؤں کو چھوڑا اور مختلف دیوتاؤں کو پوچھا ہے۔ لیکن اس نے آکاش کی اس دیوی کے حضور بلا تخصیص زمان و مکان ہمیشہ شروہا کے پھول چٹھائے اور عقیدت کی شمعیں جلائی ہیں۔ تاریخ کے مختلف ادوار میں آپ کو خدا تک کے منکرین مل جائیں گے لیکن کسی دور میں ایسا کہ وہ نہیں ملے گا جس نے آزادی کی عظمت سے انکار کیا ہو۔ انسانی تاریخ کیا ہے؟ اپنی اپنی آزادی کے تحفظ کی جدوجہد کی مسلسل داستان مختلف ادوار میں نمایاں و فراخ زمان اور اکاسرو و قیامرو دہر ہمیشہ اس کو کشش میں رہے کہ کمزور اور ناتواں انسانوں کے سینے سے آزادی کی تمنا کو مٹا دیا جائے لیکن کمزور و ناتواں انسانوں نے

اپنا سب کچھ لٹا اور مٹا گواہ کر لیا مگر آزادی کی حسین آرزوؤں کو اپنے دل کے کٹانوں سے کبھی مٹنے نہیں دیا۔ انہوں نے اس قربان گاہ پر اپنی عزیز ترین متاعِ حیات تک کی بھینٹ چڑھا دی لیکن اس کی آن پر کبھی حریف نہیں آنے دیا۔ تاریخ کے ریگ سال پران گنت مروجیں آئیں اور مختلف نقوشیں کیہا کر اپنے ساتھ لے گئیں لیکن اگر کوئی نقش ایسا تھا جو اس کی مسلسل تنگ و تانبہ کے باوجود کبھی مٹ نہ سکا تو وہ اس بطلِ جلیل کا نقش تھا جس نے آزادی کے تحفظ کی خاطر جان دے دی۔ یا پھر اس تنگ انسانیت کا نام جہانگیر پنوں کی آزادی کو دوسروں کے ہاتھوں بچا دیا۔ بہر حال، دنیا نے ہر قوم کی عظمت کو آزادی کے پیمانوں سے پاپا اور اسی کے معیاروں سے جانچا ہے۔ یہی نکتہ کہ آزادی کا لفظ دنیا کے ہر لغت میں ضرورتِ دہر انسانیت کے مرادف اور غلامی، ذلت و خواری کے ہم معنی ہو کر رہ گئی ہے۔

جو کچھ اور پرکھا گیا ہے وہ ایک حقیقت ہے۔ لیکن اس حقیقت کے باوجود کیا یہ امر باعثِ مدح و موجبِ تہنیرِ جبریت نہیں کہ آزادی کی خاطر سب کچھ کر گزرنے والا انسان آج تک یہ بھی متعین نہیں کر سکا کہ آزادی کہتے کسے ہیں؟ عوام کو تو پھر پتہ نہیں اس باب میں خواص تک کی یہ کیفیت ہے کہ وہ آزادی کی کوئی متعین (DEFINITION) بھی نہیں دے سکے۔ میرے سامنے اس وقت پولیٹیکل سائنس کی ایک کتاب ہے جو نہایت مختصر ہونے کے باوجود خاصی شہرت کی حامل ہے۔ یعنی (SOCIAL JUSTICE) یہ عصرِ حاضر کے ممتاز علمائے سیاست کے چیدہ چیدہ مقالات پر مشتمل ہے جنہیں پروفیسر (RICHARD B. BRANDT) نے ایڈٹ کیا ہے۔ اس کے ایک مقالہ میں ڈاکٹر، پینسر، کانٹ، مل، ہارٹ، رولز، پاپر، مارکس، انجلز، جیسے ممتاز مفکرین کی طرف سے پیش کردہ آزادی کی (DEFINITIONS) درج کی گئی ہیں اور اس کے بعد ہلائل و شوہر بتایا گیا ہے کہ ان میں سے کوئی فیضی نشیون بھی جامع اور واضح نہیں۔ ان تمام فکری اختلافات کے باوجود ایک بات البتہ ہر جگہ اور ہر مقام میں بطورِ تکرار مشترک پائی جاتی ہے اور وہ یہ کہ اگر کسی قوم پر کوئی دوسری قوم حکمران ہو تو اسے غلامی کہا جاتا ہے اور اپنی حکومت کو آزادی۔ چنانچہ ہندوستان میں تحریکِ آزادی سے بھی یہی مفہوم لیا گیا تھا۔ وہ تحریکِ سامراج (یعنی غیروں کی حکومت) کے مقابلہ میں سواراجیہ (اپنی حکومت) کے لئے جدوجہد تھی۔

منہا (جہانگاہ) گاندھی نے مسلمانوں میں رائج اصطلاح — حکومتِ خداوندی — کے مقابلہ میں امامِ ماجیہ کی اصطلاح وضع کی تھی لیکن وہ چل نہیں سکی تھی۔ دینِ آزادی کے لئے سواراج ہی کی اصطلاح رائج رہی۔ مقصد اس سے یہ تھا کہ ایک ہندوستان کی تحریکِ آزادی قائم کی جائے۔ یہی تحریکِ آزادی کا منہا تھا۔ اس جدوجہد

میں ہندوؤں کے علاوہ مسلمانوں کے بڑے بڑے سیاسی لیڈر اور مذہبی راہ نما، مثل مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا حسین احمد مدنی وغیرہ شامل تھے اور اس جدوجہد کو جہاد قرار دیتے تھے۔ یہ جدوجہد ایسی تھی جس کے مقصد و منہا (یعنی غیروں کی جگہ اپنی قوم کی حکومت کے قیام کے متعلق) یہ سمجھا جاتا تھا کہ اس میں دو آراء ہونے سکتے ہیں لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ جب یہ جدوجہد پورے زوروں پر تھی تو اس کے خلاف ایک آواز بلند ہوئی جس نے نہایت واضح الفاظ میں کہا کہ آزادی کا یہ مفہوم ہندوؤں کے نزدیک صحیح ہو سکتا ہے لیکن مسلمانوں کے نزدیک آزادی کا یہ مفہوم و مقصد درست قرار نہیں پاسکتا۔ ان کے نزدیک آزادی کے مفہوم اس سے مختلف ہے۔ تحریکِ آزادی کے علمبرداروں نے اس آواز کی سخت

مخالفت کی اور اس میں چونکہ یہ کہا گیا تھا کہ اسلام کی رو سے آزادی کا مفہوم اس سے مختلف ہے اس لئے اس آواز کی مخالفت میں علامہ حضرت بڑی شہید سے آگے بڑھے۔ انہوں نے مشہور یہ کیا کہ یہ آواز انگریزوں کے وضع کردہ ناقوس کی صدا کے بازگشت ہے اور مقصد اس سے آزادی کی تحریک کے راستے میں روڑے اٹکانا۔ اس آواز کے بلند کرنے والے نے کہا کہ یہ الزام سراسر کذب ہے، افترا ہے۔ جب تک انگریزوں کو ہندوستان سے نکال باہر کرنے کا تعلق ہے، مسلمان ہندوؤں سے پیچھے نہیں رہ سکتے۔ لیکن جہاں انگریزوں کا یہاں سے نکل جانا، ہندوؤں کے نزدیک مقصود و منتہی ہے، مسلمانوں کے نزدیک یہ اس جہد و جد کا منتہی نہیں قرار پا سکتا۔ یہ ان کے پیش نظر مقصد کے حصول کا ایک ذریعہ یا سنگ میل قرار پا سکتا ہے۔ یہ آواز تھی حکیم الامت علامہ اقبالؒ کی جنہوں نے مولانا حسین احمد مدنی (مرحوم) کے اعتراض کے جواب میں اپنے مفہوم کی وضاحت ان الفاظ میں کی تھی کہ :-

### علامہ اقبالؒ کی آواز

مسلمان ہونے کی حیثیت سے انگریز کی غلامی کے بند توڑنا اور اس کے اقتدار کو ختم کرنا ہمارا فرض ہے۔

لیکن اس آزادی سے ہمارا مقصد یہ نہیں کہ ہم آزاد ہو جائیں۔ بلکہ ہمارا اولین مقصد یہ ہے کہ اسلام قائم ہے اور مسلمان طاقتور بن جائے۔ اس لئے مسلمان کسی ایسی حکومت کے قیام میں مددگار نہیں ہو سکتا جس کی بنیادیں اپنی اصولوں پر چوں جن پر انگریزی حکومت قائم ہے۔ ایک باطل کو مٹا کر دوسرے باطل کو قائم کرنا چہ معنی دارد؟ ہم تو یہ چاہتے ہیں کہ ہندوستان کلیتہً نہیں تو ایک بڑی حد تک دارالاسلام بن جائے۔ لیکن اگر آزادی ہند کا نتیجہ یہ ہو کہ جیسا دارالکفر اب ہے ایسا ہی رہے یا اس سے بدتر بن جائے، تو مسلمان ایسی آزادی وطن پر ہزار لعنت بھیجتا ہے۔ میں ایسی آزادی کی راہ میں لکھتا ہوں، وہ یہ صرف کرنا عطا عطا کھانا، جیل جانا، گولی کا نشانہ بننا، سب حرام سمجھتا ہوں۔ قطعاً حرام۔

اس کے جواب میں کہا گیا کہ انگریز کے چلے جانے کے بعد ہندوستان میں جمہوری نظام نافذ کیا جائے گا۔ جسے نہ صرف یہ کہ اس وقت دنیا کا بہترین نظام سیاست تسلیم کیا گیا ہے، بلکہ وہ عین مطابق اسلام ہے۔ اس لئے **جمہوریت** اقبالؒ کا اعتراض، اس کی قدامت پرستی، تنگ نظری اور تعصب پر مبنی ہے۔ اقبالؒ نے کہا کہ جس

نظام کو ہم بہترین نظام کہتے ہو، آزادی کے عام تصور کی رو سے بھی اس کی حقیقت یہ ہے کہ :-

ہے وہی سا کہ بہن مغرب کا جس جمہوری نظام جس کے پیروں میں نہیں غیر از تو اٹھے قیصری

دیو استبداد جمہوری قبا میں پائے کو ب تو بھٹا ہے یہ آزادی کی ہے تسلیم پر یہی

اور جہاں تک اس کے اسلامی ہونے کا تعلق ہے، سن رکھو کہ :-

حلال پاؤں پہی ہو کہ جمہوری تماشا ہو

جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چگنی

لہذا، اسلامی نقطہ نگاہ سے مغرب کا جمہوری نظام ویسا ہی مردود و مطرود ہے جیسا نظام مکییت۔ اس نظام کے تحت آزادی کو ہم آزادی کہہ ہی نہیں سکتے۔ لہذا، ہندو کی تحریک آزادی کے خلاف، مسلمان اسی طرح نیرو آزاد رہیں گے جس طرح انگریز کی غلامی کے خلاف مجاذد آ رہیں۔ اس کے بعد جب تحریک آزادی کی تمام قیادت، قائد اعظمؒ نے اپنے ہاتھ میں لی تو وہ بھی مسلسل اور متواتر اقبالؒ کی پیش کردہ حقیقت کو دہراتے رہے۔ انہوں نے واضح الفاظ میں اعلان کیا کہ



ہم ہندو اور مسلمان دونوں میں ہیں۔ نہ صرف یہ کہ ہمارا مذہب ایک دوسرے سے مختلف ہے بلکہ ہمارا  
کچھ بھی الگ ہے۔ ہمارا مذہب ہمیں ایک ایسا ضابطہ حیات عطا کرتا ہے جو زندگی کے ہر شعبے کو محیط  
ہے۔ ہم اسی ضابطہ کے مطابق زندگی بسر کرنا چاہتے ہیں۔۔۔ مسلمان اس لئے پاکستان کا مطالبہ کرتے  
ہیں کہ اس مملکت میں وہ اپنے ضابطہ زندگی، اپنے ثقافتی نشوونما اور روایات اور اسلامی قوانین کے  
مطابق زندگی بسر کر سکیں۔ (نقاد بر محمد علی جناح - جلد دوم - صفحہ ۳۳۳ و ۳۳۶)

یہ تھا آزادی سے مفہوم کے متعلق ہمارا اختلاف جس کی بنا پر ہم نے انگریز اور ہندو دونوں کے خلاف عداوت قائم کیا تھا۔ ہماری  
یہ عداوت آج اس وقت تک جاری رہی جب تک ہم نے پاکستان حاصل نہ کر لیا۔  
ہم نے آزادی کے اپنے مفہوم کے لئے پاکستان حاصل کر لیا لیکن اس کے بعد دنیا نے ایک عجیب تماشا  
دیکھا کہ یہاں پہنچ کر ہم نے مغرب کے اس جمہوری نظام کو مانج کر لیا جسے اقبالؒ نے اسلام کے خلاف سازش قرار دیا  
تھا۔ علامہ اقبالؒ نے دو باتیں کہی تھیں۔ ایک یہ کہ مغرب کا جمہوری نظام، استبداد و مملکت ہی کی ایک نقاب پوش شکل  
ہے۔ اس میں نوع انسان کبھی آزادی سے ہلکا نہ بنیں ہو سکتی۔ اور دوسرے یہ کہ یہ نظام، اسلام کی ضد ہے۔ اس لئے  
اس میں مسلمان کو وہ آزادی میسر نہیں آ سکتی جو اسے اسلام عطا کرنا چاہتا ہے۔ میں آج کی نشست میں اقبالؒ کے ان  
جرو و دعاوی کا جائزہ لے کر دیکھنا چاہتا ہوں کہ کیا اپنی آزاد مملکت کے حصول کے بعد مغرب کے جمہوری نظام میں ہمیں  
حقیقی آزادی نصیب ہو گئی ہے، اور دوسرے یہ کہ اس نظام کے متعلق محمد مغرب کے ارباب فکر و دانش اب کس  
نتیجہ پر پہنچے ہیں۔

- جمہوری نظام کے اساسی اصول** | مغرب کے جمہوری نظام (ڈیموکریسی) کے بنیادی اصول حسب ذیل ہیں:-
- ۱۔ اقتدار کا سرچشمہ عوام ہیں اور ان کے اس اقتدار پر کسی اور کا کنٹرول نہیں۔ عوام کو اقتدار مطلق حاصل ہے۔ (DEMO-CRACY) کے معنی ہی عوام کی حکومت ہیں۔
  - ۲۔ اس نظام میں عوام اپنے حاکم آپہ ہوتے ہیں اس لئے حاکم اور محکوم میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔ اس میں یہ تفریق ہی مٹ جاتی ہے۔
  - ۳۔ عوام اپنے اس اقتدار کو اپنے نمائندگان کے ذریعے بروئے کار لاتے ہیں۔
  - ۴۔ ان نمائندگان کی اکثریت کے فیصلے، یعنی وہ آئین یا قوانین جنہیں وہ وضع کر دیں، حریف آخر ہوتے ہیں جن کے خلاف کہیں اپیل نہیں ہو سکتی۔ البتہ یہ نمائندے اپنے فیصلوں کو جب بھی چاہیں خود بدل سکتے ہیں۔
  - ۵۔ عوام کے یہ نمائندے وہ گروہ و گروہوں میں ہٹ جاتے ہیں۔ جو گروہ اکثریت میں ہوتا ہے وہ سیاہ و سفید کا مالک ہو جاتا ہے جو اقلیت میں رہ جاتا ہے اس کا مسلک اکثریت کی مخالفت کرنا اور ایسے حالات پیدا کرنا ہوتا ہے جن کی رو سے ان کی اکثریت اقلیت میں تبدیل ہو جائے اور اس طرح اقتدار ان سے چھین کر ان کے ہاتھ میں آجائے۔
  - ۶۔ بدستور اقتدار (اکثریتی) پارٹی جو کچھ جی میں آئے کرے۔ اسے اس مدت سے پہلے جس کے لئے عوام نے انہیں اپنا نمائندہ منتخب کیا تھا، خود عوام ہی برطرف نہیں کر سکتے بلکہ اس کے کہ وہ اکثریت میں نہ رہیں۔

مغرب کے ارباب فکر و نظر اس نظام کے عملی تجربہ کے بعد اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ یہ نظام ایسے مفروضوں پر مبنی ہے جن کا یا تو وجود ہی کوئی نہیں اور یا، جو یکسر باطل ہیں۔ قبل اس کے کہ ہم ان ارباب علم و دانش کے نتائج فکر کو سامنے لائیں یہ دیکھنا ضروری ہے کہ مغرب کے اس نظام کو وضع اور اختیار کن حالات میں کیا تھا۔

اقوام یورپ استبداد کی جگی کے دوپاتوں میں بڑی طرح پس رہی تھیں۔ یعنی ملکیت کی قربانی اور ارباب کلیسا کی قیادگی۔ — نتیجہ اگر ایسی کا نظریہ سینٹ ہال کا وضع کردہ ہے جس نے کہا تھا کہ

## یورپ کا انقلاب

مٹی حکومت صرف خدا کو حاصل ہے لیکن اس نے اپنا یہ حق کلیسا (پادریوں) کو تفویض کر دیا ہے۔ اب یہ خدا کے نام پر جوجی میں آئے کریں۔ جب کلیسا اور رومن شہنشاہیت میں گٹھ جوڑ ہوا تو یہی اختیار خداوندی شہنشاہوں کی طرف منتقل ہو گئے۔ لیکن ان پر کٹرول کلیسا ہی کا رہا۔ مگر نئے اپنی اصلاحی تحریک سے کلیسا کے فساد دی شکست کھائی کہ یہ کہہ کر توڑ ڈالا کہ انجیل کے سمجھنے کا حق ہر فرد کو حاصل ہے نہ کہ صرف چرچ کو۔ لیکن اس سے نظام حکومت کا مسئلہ حل نہ ہو سکا کیونکہ انجیل میں حکومت اور سیاست کے متعلق کوئی قانون ہی نہیں دیا گیا۔ لہذا حکومت کا استبداد بدستور قائم رہا۔ اس صورت حالات سے تنگ آ کر فرانس میں ایک انقلاب برپا ہوا جس کا نتیجہ روسو کا نظریہ حکومت تھا۔ اس

نظریہ کی رو سے کہا گیا کہ حق اقتدار نہ بادشاہوں کو حاصل ہے نہ کلیسا کے خدائی نمائندوں کو۔ اقتدار کا سرچشمہ عوام ہیں۔ یورپ نظام جمہوریت کا ابتدائی تصور سامنے آیا اگرچہ اس کا اساسی تصور مفکرین یونان نے بہت پہلے پیش کیا تھا۔ ملکیت اور کلیسا کے استبداد کی جگی میں پسے والی انسانیت نے اس نظریہ کو نجات دہندہ سمجھ کر نہایت جوش و خروش اور مسرت و اقبساط سے اس کا غیر مقدم کیا اور اسے نوع انسان کے لئے آئینہ رحمت سمجھا۔ ان تصورات سے آپ نے دیکھ لیا ہوگا کہ نظریہ جمہوریت (ڈیموکریسی) کے سامنے آنے پر یہ جوش و مسرت، درحقیقت استبداد

ملکیت اور قربانی مذہبی پیشوائیت سے حصول نجات پر منقبذانہ رد عمل تھا۔ نظام جمہوریت کی کامیابی پر مثبت اظہار و تشکر نہیں تھا۔ اس نظام پر تو ابھی تجربہ بھی نہیں ہوا تھا۔ اس کے عملی تجربہ کے بعد مغربی مغرب جس نتیجہ پر پہنچے ہیں، اس

منہ میں اپنی کتاب "انسان نے کیا سوچا" کے ایک باب میں تفصیل سے لکھ چکا ہوں۔ مزید تصویحات اب پیش خدمت ہیں۔ مفکرین مغرب کے عملی تجربہ کا ملخص کیمبرج یونیورسٹی کے پروفیسر (EWING) کے الفاظ میں یہ ہے کہ

اگر روسو عصر حاضر میں جمہوری نظام کے عملی تجربہ سے پہلے اپنی کتاب دیکھتا تو وہ نظام جمہوریت کے متعلق کبھی ایسی خوش فہمی سے کام نہ لیتا (تمام حوالے خطاب کے آخر میں ملیں گے)۔

①

اس نظام کی بنیاد اس مفروضہ پر رکھی گئی تھی کہ اس میں لوگ عموماً اپنی حکومت آپ قائم کرتے ہیں اور اس طرح حاکم اور محکوم کا امتیاز ختم ہو جاتا ہے۔ لیکن فرانسیسی مفکر رینی گوسن اس باب میں لکھتا ہے کہ :-

اگر لفظ جمہوریت کی تعریف یہ ہے کہ لوگ خود اپنی حکومت آپ قائم کریں تو یہ ایک ایسی چیز کا بیان ہوگا جو نہ کبھی پہلے وجود میں آئی تھی اور نہ آج کو یہ موجود ہے۔ اس میں جو لوگ برسر اقتدار آجاتے ہیں، ان کی سب سے بڑی قابلیت اس میں ہوتی ہے کہ وہ لوگوں کے دل میں یہ عقیدہ قائم کر دیں کہ ان پر کوئی حاکم نہیں وہ اپنے حاکم آپ ہیں۔ یعنی حکومت عوام کی ہے۔

②

شکاگو یونیورسٹی کا فلسفہ کا پروفیسر (ALAN GEWIRTH) حقیقت کی نقاب کشائی ان الفاظ میں کرتا ہے :-

اس نظام میں ہر ایک یا قوم کے الفاظ ایک افسانہ سے زیادہ کوئی حیثیت نہیں رکھتے۔ اس میں درحقیقت محض موثر ہادیاں اپنا وجود رکھتی ہیں جو ایک دوسرے سے متصادم ہوتی رہتی ہیں۔ اس نقطہ نگاہ سے دیکھتے تو نظریہ جمہوریت پر کئی خطبات کا پیدا کر دیا جاتا ہے جس میں صداقت، نیکی اور حسن عمل کے الفاظ کے حریف ہوتے ہیں جن کے ساتھ یہ گروہ میدان کارزار یا مارکٹ میں سامنے آتے رہتے ہیں۔

اس نظریہ کا دوسرا مفروضہ یہ ہے کہ اس میں حکومت، عوام کی رضا مندی سے قائم ہوتی ہے اور جو حکومت کسی کی رضا مندی سے قائم ہو اس کی فرائض پذیری اس پر لازم آجاتی ہے۔ لہذا جمہوری نظام میں برسرِ اقتدار گروہ کی حکمرانی استبداد نہیں چڑتا، عوام کی بطیب خاطر رضا مندی پر مبنی نظام اطاعت ہوتا ہے۔ پروٹیسٹر (GEWIRTH) اس باب میں لکھتا ہے کہ "یہ مفروضہ بھی محض انسانی ہے"۔ اس نظام میں لوگ اس حکومت کی اطاعت پر مجبور ہوتے ہیں جو اکثریت کی قائم کردہ ہوتی ہے جس اقلیت نے ان نمائندوں کے خلاف ووٹ دیئے تھے یا جنہوں نے سرے سے ووٹ ہی نہیں دیئے تھے۔ ان کی اطاعت کو بطیب خاطر اطاعت کیسے قرار دیا جاسکتا ہے؟

جمہوری نظام میں روسو کے مفروضہ کے مطابق، حق اقتدار عوام کی مرضی کو حاصل ہوتا ہے اور یہ اقتدار بلا حدود و قیود ہوتا ہے۔ فرانسیسی مفکر (BERTRAND DE JOUVENEL) نے (SOVEREIGNTY) کے نام سے ایک بڑی عمدہ کتاب لکھی ہے۔ وہ اس باب میں لکھتا ہے :-

برادری تعین یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ اگر ایک دفعہ آپ اس اصول کو تسلیم کر لیں کہ انسانی مرضی اور ارادے (HUMAN WILL) کو اقتدار مطلق حاصل ہو سکتا ہے تو اس کے بعد جو نظام ہائے حکومت بھی قائم ہوں گے حقیقت کے اعتبار سے وہ سب ایک جیسے ہوں گے۔ نظام ملکیت اور جمہوری نظام بظاہر ایک دوسرے کی ضد ہیں لیکن اس اصول کی مدد سے دونوں کا شعوری قالب ایک ہی ہوتا ہے۔ جس کے ساتھ میں اقتدار ہو۔ اصول اسے یکساں حق مطلق انسانی عطا کر دیتا ہے (صفحہ ۱۹۹)

اس مفکر کی اس تحقیق کے بعد اقبال کا وہ شعر پھر سامنے لائیے جو اس نے اس سے بہت پہلے کہا تھا اور جسے میں شروع میں پیش خدمت کر چکا ہوں کہ :-

ہے وہی ساز کہن مغرب کا جمہوری نظام جس کے پردوں میں نہیں خیر از نوائے قیصری  
آپ نے دیکھا کہ جس شخص کی بصیرت شمع قرآنی سے کپ ضیا کرتی ہو وہ کس قدر جلد حقائق کو بے نقاب دیکھ لیتا ہے۔ اس کی کیفیت یہ ہوتی ہے — کہ خارے دید و اعمال جن گفت۔ اور اسی بنا پر وہ حتم و یقین کے ساتھ (لیکن بغیر کسی "دعویٰ" کے) کہہ سکتا ہے کہ :-

خارشہ وہ جوا بھی پر دہ افلاک میں ہے عکس اس کا میرے آئینہ ادراک میں ہے

پڑھیں گے کہ انسانی ارادے کو مطلق اقتدار کا حق موندینے کا نتیجہ استبداد اور مطلق انسانی کے سوا کچھ نہیں ہو سکتا، خواہ نظام کوئی سا بھی کیوں نہ ہو اس سے مغربی مفکرین کے سامنے یہ اہم سوال آیا کہ اگر انسانوں کو یہ حق حاصل نہیں ہو سکتا تو پھر حق مطلق کیسے حاصل ہو سکتا ہے؟ وہ لوگ اپنی مدت العمر کے نگرانی تجسس کے بعد اس باب میں جس نتیجے پر پہنچے ہیں وہ انتہائی غور و تحقیق کا متقاضی ہے۔ ان ارباب فکر کا کہنا ہے کہ نظام حکومت مقصود بالذات نہیں۔ یہ ایک



**عدل سے مراد** بلند مقصد کے حصول کا ذریعہ ہے۔ اور وہ بلند مقصد ہے قیامِ عدل۔ اس کے بعد عدل کے متعلق ان کی تصویحات اور تقاضے ملاحظہ فرمائیے۔ شیگن یونیورسٹی کا فلسفہ کا پروفیسر

( WILLIAM K. FRANKENA ) لکھتا ہے کہ :-

عدل قوانینِ مملکت کے مطابق فیصلوں کو کہا جاتا ہے۔ قانون کی اصطلاح میں تو ایسا کہنا درست ہو سکتا ہے لیکن سوال یہ ہے کہ اگر خود مملکت کے قوانین ہی عدل پر مبنی نہ ہوں تو ان کے مطابق عملی اقدامات کو آپ سوشل جسٹس کس طرح کہہ سکیں گے۔

(۵)

اس سے یہ اہم سوال پیدا ہوا کہ اگر مملکت کے قوانین بہر حال مبنی برحق و صداقت قرار نہیں پاسکتے تو پھر حق و باطل اور ( JUST AND UNJUST ) کا معیار کیا ہوگا۔ اس سوال کے جواب میں وہ پروفیسر ( LEWIS ) کے الفاظ میں لکھتا ہے کہ :-

حق اسے کہیں گے جو تمام حالات میں حق ہو اور ہر فرد کے لئے یکساں طور پر حق ہو۔ عالمگیریتِ حق کی بنیادی شرط ہے۔

(۶)

نہ صرف عالمگیریت بلکہ اہدیت بھی — یعنی اسے ہر زمانے میں حق ہونا چاہیئے۔ اس سلسلہ میں وہ ٹینیسن کا یہ شعر نقل کرتا ہے کہ۔ نیکی، صداقت یا پاکیزگی اور عدل ان سے اہدیت کی کشش نکال دیجئے تو یہ سب راکھ کا ڈھیر بن کر رہ جائیں گے۔

اس کے بعد وہ ( EMIL BRUNNER ) کا یہ قول درج کرتا ہے کہ :-

جو شخص فی الواقعہ سنجیدگی کے ساتھ کہتا ہے کہ فلاں بات مبنی بر عدل اور فلاں، ظلم پر مبنی ہے وہ درحقیقت کہتا ہے کہ عدل اور ظلم کے ماپنے کا ایک ایسا پیمانہ ہے جو تمام انسانی قوانین، معاہدات، رسوم و رواج سے اوپر ہے۔ وہ ایک ایسا معیار ہے جس سے تمام انسانی معیار ماپے اور پرکھے جاسکتے ہیں۔ یا تو اسے تسلیم کرنا ہوگا کہ عدل کے لئے اس قسم کا مطلق الوہیاتی معیار موجود ہے ورنہ اس لفظ کا مفہوم انفرادی بن کر رہ جائے گا جو ایک کے نزدیک قابل قبول ہوگا اور دوسرے کے نزدیک ناقابل تسلیم۔ عدل کے لفظ کا مفہوم یا تو خداوندی فیصلہ ہوگا جس کے ساتھ حق مطلق (الحق) ہونے کی تقدیس شامل ہوگی، اور یا پھر یہ چھوٹے نگوں کی مینا کاری اور خالی برتنوں کی کھڑکھڑاہٹ ہوگی۔

(۷)

آکسفورڈ اور کیسج کے ایک ممتاز صاحبِ علم ( ERNEST BARKER ) نے سیاستِ مدن سے متعلق ایک بلند پایہ کتاب لکھی ہے۔

( PRINCIPLES OF SOCIAL AND POLITICAL THEORY )

**ابدی اور غیر متبدل قانون**

وہ اس میں لکھتا ہے :-

اس مقام پر ہمارے سامنے یہ سوال آتا ہے کہ کیا مملکت کے آئینی قانون کے شانہ بشانہ کوئی ایسا قانون بھی موجود ہے جو حقیقی اقدار پر مبنی ہے۔۔۔۔۔ وہ قانون جسے ہم "فطری" کہہ سکیں کیونکہ وہ اشیائے کائنات کی فطرت، یا خود انسانی فطرت کے مطابق ہوتا ہے۔ وہ قانون جو اس الحق پر مبنی ہوتا ہے جو اپنی ذات میں حق ہوتا ہے۔ جو اس عدل پر مبنی ہوتا ہے جو ہر جگہ اور ہر زمانے میں عدل ہوتا ہے۔ جو ان اقدار پر مبنی ہوتا ہے جو

اپنی قیمت آپ ہوتی ہیں خواہ انہیں آئینی حیثیت حاصل ہو یا نہ۔ یہ سوال آج کا پیدا شدہ نہیں ہے (SOPHOCLES) اور ارسطو کے زمانے میں بھی موجود تھا۔ ارسطو نے اس قانون میں جسے کوئی قوم خود وضع کر کے اپنے لئے اختیار کر لے اور اس میں جو تمام کورج انسان کے لئے عالمگیر ہو، تصریح کرتے ہوئے کہا تھا کہ مؤخر الذکر قانون، قانون فطرت ہے۔ .... وہ قانون جو اس وقت بھی موجود ہوتا ہے جب نہ کسی قوم کا وجود ہو اور نہ کسی ایسے معاہدہ کا وجود جو مختلف افراد کو ایک رشتے میں منسلک کر دے۔ اس کی تائید میں ارسطو نے سوفوکلس کا یہ شعر درج کیا ہے کہ:-

اس قانون کی قوت، امروز و فردا کی پابند نہیں ہوتی۔ وہ ایک دائمی چشمہ سے پھوٹتا ہے جس کے منبع کا کسی انسان کو علم نہیں۔ (ص ۹)

اس کے بعد وہ (BLACKSTONE) کا یہ قول نقل کرتا ہے کہ:-

قانون فطرت کی اطاعت دنیا کی ہر اطاعت پر مقدم ہے۔ انسانوں کا وضع کردہ کوئی قانون جو اس قانون فطرت کے خلاف ہو کبھی جائز قرار نہیں پاسکتا۔ (ص ۱۰)

امریکی پروفیسر (EDWARD CORWIN) نے جو کانسٹیٹوشن اور اس کی تاریخ پر اتھارٹی تسلیم کیا جاتا ہے ایک نہایت مختصر لیکن بڑی پُر مغز کتاب لکھی ہے جس کا نام ہے (THE HIGHER LAW)۔ اس کی بحث و تحقیق کا حاصل یہ ہے کہ انسانوں کے وضع کردہ آئین کی بنیاد ان اصول و اقدار پر ہوتی چاہیے جو انسانوں کی وضع کردہ نہ ہوں اور زمان و مکان کی حدود سے ناکشا ہوں۔ وہ اپنی کتاب میں لکھتا ہے کہ یہ نظریہ کہ مملکت کے آئین کو اس لئے بالادستی (SUPREMACY) حاصل ہے کہ اس کی جڑیں عوام کے ارادے (پاپولر ویل) کی پیدا کردہ ہیں، امریکن آئین میں بعد کا پیدا شدہ ہے۔ ابتداء میں آئین کی فوقیت کا بنیادی معیار غیر متبدل اور لا ابدی عدل کا تصور تھا اور انسانی ارادہ کو اس میں نسبتاً بہت کم دخل تھا۔ یہ نظریہ موجودہ قانون کی ضد تھا۔ اس میں اس حیثیت کو تسلیم کیا گیا تھا کہ کائنات میں حق و صداقت اور عدل کے ایسے اصول موجود ہیں جنہیں اس کا حق حاصل ہے کہ وہ اپنی ذاتی قدر و قیمت کی بناء پر باقی اصولوں پر غالب رہیں، اس بات کی پردہ کٹے بغیر کہ قوم کے برسرِ اقتدار طبقہ کا اس باب میں کیا طرزِ عمل ہے۔ ان اصولوں کو کسی انسانی ہاتھ نے نہیں بنایا۔ یہ اصول اگر خود خدا سے قدیم نہیں تو اتنا ضرور ہے کہ ان کی روت سے خدا کا ایسا تصور سامنے آتا ہے جو انہیں کنٹرول کرتا اور باہر مگر مربوط رکھتا ہے۔ یہ اصول موجودی الخارج .... اور ادنیٰ ابدی اور غیر متبدل ہیں۔ (ص ۱۱)

اس کے بعد کاوٹن، مشہور متفکر (CICERO) کے یہ الفاظ نقل کرتا ہے :-

حقیقی قانون، مبنی بر حکمت اور فطرت سے ہم آہنگ ہوتا ہے۔ یہ فضا میں ہر جگہ پھیلا ہوا، غیر متبدل اور ابدی ہوتا ہے۔ یہ قانون معروف و نامعلوم، منکر سے روکتا ہے۔ یہ مملکت کا مقدس فریضہ ہے کہ کوئی ایسا قانون نافذ نہ کرے جو اس قانون کے خلاف ہو۔ اسے اس کا حق حاصل نہیں کہ وہ اس میں کسی قسم کی ترمیم کرے۔ نہ ہی وہ اسے منسوخ کر سکتی ہے۔ نہ ہمارے پارلیمان اور نہ ہی سینیٹ کو اس کا اختیار ہے کہ وہ لوگوں کو اس قانون کی اطاعت سے آزاد کر دے .... نہ ہی اس قانون کی یہ کیفیت ہے کہ دو ماہ کے لئے الگ قانون ہو اور ایتھنز کے لئے الگ۔ ایک قانون آج ہو اور دوسرا کل۔ یہ ایک انل،

غیر متبدل قانون ہے جو اہدی طور پر تمام اقوام کو اپنی رنجیروں میں بکڑے ہوئے ہے۔ (ص ۱۸)  
اس کے بعد وہ (CICERO) کے یہ ناقابل فراموش الفاظ درج کرتا ہے کہ  
سچا قانون وہ ہے جو فطرت کے عطا کردہ معیار کے مطابق حق اور باطل میں امتیاز کر دے۔ اس کے سوا  
کوئی قانون بھی ہو اسے نہ صرف یہ کہ قانون سمجھنا نہیں چاہیے۔ اسے قانون کہنا ہی نہیں چاہیے۔ (ص ۱۹)  
نہ صرف یہ کہ ایسے قانون کو قانون سمجھنا اور کہنا نہیں چاہیے (BARKER) کہتا ہے کہ ایسے قانون کی اطاعت ہی  
نہیں کرنی چاہیے۔ اس کے الفاظ یہ ہیں :-

ملکت کے ساتھ میری وفاداری (LOYALTY) ان اقدار کے تابع ہے جن کے تحفظ کے لئے ملکت  
کا وجود عمل میں آیا ہے۔ اگر یہ ملکت ان اقدار کی وفاداری نہیں رہتی تو ان اقدار کے تقاضے کی رو سے  
میں مجبور ہو جاتا ہوں کہ اپنی وفاداری کو عدم وفاداری میں بدل دوں اور اس طرح ایک خوشگوار فرماں  
پذیری کے بجائے بادل ناخواسیہ مزاحمت کی روش اختیار کر لوں۔ (ص ۱۹)

حقیقت یہ ہے کہ یہ مفروضہ ہی غلط ہے کہ ملکت ایسے معاہدہ کا بنیادی حق رکھتی ہے جس کی رو سے ہم  
پر اس کی اطاعت بہر حال واجب ہو۔ اس کے بجائے امر واقعہ یہ ہے کہ ملکت عمل کی مظہر اور اسے  
عمل میں لانے کا ذریعہ ہے۔ ہم پر ملکت کے اسباب اختیارات کے احکامات کی پابندی اس لئے لازم ہوتی  
ہے کہ ملکت عمل قائم کرنے کا ذریعہ ہوتی ہے۔ اگر ملکت ایسی نہیں رہتی تو اس کے ساتھ ہماری وفا  
منجاری اور اطاعت ختم ہو جاتی ہے (ص ۱۹)

آگے چل کر وہ کہتا ہے :-

حقیقت یہ ہے کہ سیاسی اطاعت کا وجوب بشرط ہوتا ہے مطلق نہیں ہوتا یہ اطاعت ہر حالت میں  
واجب نہیں ہوتی۔ یہ اس وقت تک واجب ہوتی ہے جب تک یہ حق کے کسی بلند تقاضا کے ساتھ  
ٹکرائے نہیں۔ (ص ۲۰)

آپ نے خود فرمایا عزیزان من ! کہ نظام جمہوریت کے تلخ نتائج کا شکار ہوا انسان اب کس قسم کے قانون کی تلاش  
میں ہے۔ ایک انہی واہدی، عالمگیر قانون جس کا مترشحہ انسانی فکر سے بلند اور مادہ و عہدہ !  
اس کے بعد مغرب کا یہ مفکر بعد حمان و یاس، ایک ٹھنڈی سانس بھر کر کہتا ہے کہ جمہوری نظام کے ہاتھوں  
تنگ آئے ہوئے مثلاً مشیائین حقیقت کی شکل یہ تھی کہ اس قسم کے قوانین فطرت کا ضابطہ کہیں موجود نہ تھا۔

(BARKER . P. 100)

انسانوں کے خود ساختہ قوانین و ضوابط کا ستیا ہوا انسان آج بھی اپنے آپ کو اسی مقام پر پاتا ہے جہاں اُس زمانے کا انسان  
مفکرین مغرب کی دشواری تھا جس نے ملکیت اور مذہبی پیشیائیت کے استبداد سے نجات کی راہ نظام  
جمہوریت میں سمجھی تھی۔ اب اس کی کیفیت یہ ہے کہ جسے حیات حیات سمجھ کر  
اس کی طرف لپکا تھا وہ سراب ثابت ہوا۔ اور حیات حیات کا اب بھی اسے کوئی سراغ نہیں مل رہا اگرچہ اس کی تلاش  
میں وہ اس قدر سرگرداں و حیران اور مضطرب و بیتاب ہے۔ ان کی فکر نے انہیں اتنا توتلادیا ہے کہ وہ ضابطہ قوانین

جس میں انسانیت کی نجات کا لازماً مضمر ہے، کس قسم کا ہونا چاہیئے۔ وہ ازلی ابدی، زمان و مکان سے ماوراء عالمگیر ہونا چاہیئے۔ وہ اس نتیجہ پر بھی پہنچ چکے ہیں کہ ایسا قانون انسانوں کا خود ساختہ نہیں ہو سکتا۔ انسانی فکر ایسا ضابطہ قوانین وضع ہی نہیں کر سکتی۔ اس کا سرچشمہ انسانی فکر سے ماوراء ہونا چاہیئے۔ وہ یہاں تک تو پہنچ گئے ہیں۔ لیکن وہ اُسے منقول من اللہ یا وحی کہہ کر نہیں پکارتے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ گھڑتے ہیں کہ اگر ہم نے اُسے قانون خداوندی کہہ دیا تو پادری یہ کہتے ہوئے بھاگے بھاگے آجائیں گے کہ جس قانون خداوندی کے ہم متقاضی ہو وہ قانون ہم دے سکتے ہیں کیونکہ ہم خدا کے نمائندے ہیں۔ اس سے ان پر تھیا کہ ایسی کا وہی استبداد پھر مسلط ہو جائے گا جس سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لئے انہوں نے نظام جمہوریت وضع اور اختیار کیا تھا۔ اس گھڑتے وہ اپنے مطلوبہ ضابطہ قوانین کو قانون فطرت یا فطرت انسانی میں مضمر قانون جیسی مبہم اصطلاحات سے تعبیر کرتے ہیں۔ ان کی دوسری تسک یہ ہے کہ انہیں اس کا پتہ نہیں چلتا کہ یہ قانون ملے گا کہاں سے؟ فکر مغرب کی یہی بے کلی اور بیانی اور دوسری طرف بے بسی اور بے چارگی تھی جس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اقبالؒ نے کہا تھا کہ :-

مشرق ناہید و غمزدی گزودش صورتار عقل کو تابع مندریان نظر کرنے کا

اور جس کا نتیجہ یہ ہے کہ

جس نے صورت کی شعاعوں کو گرفتار کیا زندگی کی شب تاریک سحر کر دسکا

مغربی اقوام کی بے بسی کا تو یہ عالم ہے لیکن مسلمان کی حالت ان سے بھی عجیب تر ہے۔ صدیوں کی غلامی اور محکومی نے ان کی مسلمانوں کی حالت

انگریز مصلحتوں کی کو سلب کر دیا ہے۔ محکومیت اس لئے ہندوین لعنت ہوتی ہے کہ اس میں اقبالؒ کے الفاظ ہیں — ”جاں بھی گرو غیر، بدن بھی گرو غیر“ ہوتے ہیں۔ محکوم اگر کسی وقت اپنے بدن کو (حاکم قوم) کے قبضہ سے بچھڑا لیتا ہے تو بھی اس کی جان اس کے قبضے میں بدستور رہتی ہے۔ وہ دیکھتا ہے اس کی آنکھ سے، سنتا ہے اس کے کانوں سے، سوچتا ہے اس کے دماغ سے۔ وہ قوم غالب کے ہر نظریہ مسلک یا نظام کو عرشوں میں سے نازل شدہ سمجھتا اور اس کی تقلید کو اپنے لئے موجب نیرافروز مباحات قرار دیتا ہے۔ اقوام غالب اپنی چھوٹی ہوئی بڑیاں اس کی طرف پھینکتی ہیں اور یہ انہیں پک کر اٹھاتا اور اپنے لئے خوانِ یغما سمجھتا ہے۔ حصول آزادی (تشکیل پاکستان) کے بعد جب ہمیں ایک نظام کی ضرورت پڑی تو ہم نے مغرب کے جمہوری نظام کو صحیفہ آسمانی سمجھ کر تقدس کے ہاتھوں سے اٹھایا اور عقیدت کی آنکھوں کے ساتھ لگا کر اسے بکمال فخر و مباحات اپنے ہاں نافذ کر لیا۔ حالانکہ اس وقت یہ نظام خود اقوام مغرب کے ہاں ناکام تجربہ ثابت ہو رہا تھا اور جیسا کہ میں نے ابھی بتایا ہے، وہاں کے مفکرین کسی دوسرے نظام کی تلاش میں سرگرداں تھے۔ ہمارے ہاں شروع میں تو اس نظام کی حیثیت سیاسی مصلحتی لیکن جب مذہبی پیشوائیت کے سینے میں ہوس اقتدار نے انگریزوں کی طاقت کا سرچشمہ تقلید پرست غلام کی مذہب سے وابستگی کا جذبہ نکھا۔ انہوں نے اس سے فائدہ اٹھایا اور ”بکالی جمہوریت“ کی ترکیب چلائی۔ اس طرح اس نظام کو جو سیکورل اقوام کے ہاں بھی بدد قرار پا چکا تھا، عین اسلامی کہہ کر غلام کو اپنے پیچھے لگا لیا۔ اس کا نتیجہ یہ کہ اس آزادی کا حصول تو درکنار جس کے لئے اس مملکت کو حاصل کیا گیا تھا، ہم مغرب کی شکست خوردہ



اتوام کے حاشیہ برادر (CAMP FOLLOWERS) بن کر رہ گئے۔

جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں، جمہوری نظام کی اصل و اساس اس مفروضہ پر ہے کہ اقتدار کا سرچشمہ عوام ہیں۔ انہی کو حق حکومت پہنچنا ہے اور ان کے نمائندوں کی اکثریت کو آئین و قانون سازی کا حق حاصل ہونا ہے۔

قرآن کی نظر سے اس مفروضہ کو باطل قرار دیتا ہے۔ اس کے نزدیک کسی انسان کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ دوسرے انسانوں کو اپنا محکوم بنائے۔ خواہ وہ ایک انسان ہو یا انسانوں کا کوئی گروہ (گروہ)۔ قرآن کریم کے اس اولین اصول کی رو سے ایک طرف مغربی نظام جمہوریت بہت خلاف اسلام قرار پا جاتا ہے اور دوسری طرف اس سے آزادی اور غلامی کا صحیح تصور سامنے آ جاتا ہے۔ اس کی رو سے انسانوں کی حکومت خواہ وہ اپنی قوم کی ہو اور خواہ کسی دوسری قوم کی، بہر حال غلامی ہے۔ اس سے علامہ اقبالؒ کے اس جواب کی حقانیت نکھر کر سامنے آ جاتی ہے جو انہی نے (مولانا حسین احمد دینی مرحوم) کو دیا تھا اور جس میں کہا تھا کہ اگر انگریز ہندوستان سے چلا جائے اور اس کی جگہ اہل ہند کی اپنی حکومت قائم ہو جائے تو ہندو کے نزدیک بیشک یہ آزادی قرار پا جائے گی۔ لیکن مسلمان کے نزدیک جو قرآن کا متبع ہے یہ بدستور غلامی کی غلامی رہے گی اور ایک باطل نظام کو بٹھا کر اس کی جگہ دوسرے باطل نظام کا قیام۔ اس کے بعد سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر حق حکومت کسی انسان کو حاصل نہیں تو پھر یہ حق کسے حاصل ہے۔ اس لئے

حق حکومت صرف خدا کو حاصل ہے | قرآن کا یہ منشاء تو ہو نہیں سکتا کہ انسانوں میں نظام حکومت سرے سے ہو ہی نہ۔ وہ انہوں کی تقدی زندگی کے لئے

نظام حکومت ضروری قرار دیتا ہے۔ اس کا کہنا یہ ہے کہ حق حکومت صرف خدا کو حاصل ہے۔ (إِن الْحُكْمَ وَالْأَمْرَ لِلَّهِ) (پہلا) وہ اپنے اس حق حکومت میں کسی کو شریک نہیں کرتا۔ (لَا يَشْرِكُ فِي حُكْمِهِ أَحَدًا) (پہلا) بنا بریں۔ (أَمَرَ أَتَقْبَلُونَ) (پہلا) اس نے حکم دیا ہے کہ اس کے سوا کسی کی حکومت اختیار نہ کی جائے۔ (ذَٰلِكَ السِّلَاسُ الْأَقْبَلُ) (پہلا) تو کون اُٹھائے گا اللہ اس کو قبول کرے گا۔ (یہی حکم نظام حیات ہے لیکن اکثر لوگ اس بات کو سمجھتے نہیں اور وہ انسانی حکومتوں کی ہیئت (FORM) بدل کر مطمئن ہو جاتے ہیں کہ ہم نے غلامی کی زنجیریں توڑ کر آزادی حاصل کر لی ہے۔ ہیئت کے بدل دینے سے حقیقت نہیں بدل جاتی۔

لیکن اس سے وہ خدشہ سلنے آ جاتا ہے جس سے مجروح ہو کر اہل مغرب کے نظام جمہوریت اختیار کیا تھا۔ وہل مذہبی پیشوائیت نے یہی کہا تھا کہ حق حکومت کسی انسان کو حاصل نہیں، خدا کو حاصل ہے، لیکن خدا اپنی حکومت اپنے نمائندگان کے ذریعے قائم کرتا ہے جنہیں وہ اپنے اختیارات تفویض کر دیتا ہے۔ ہم اس کے تادم سے ہیں، اس لئے ہماری حکومت انہوں کی حکومت نہیں، خدا کی حکومت ہے۔ اس سے نظیرا کسی کا وہ نظام حکومت وجود میں آ گیا جو ملکیت سے بھی بدتر تھا۔ ملکیت کے خلاف تو بغاوت بھی کی جاسکتی تھی جس کی نوعیت بہر حال سیاسی بھی جاتی تھی۔ خدا کے من (مزعوم) نمائندوں کے خلاف بغاوت، خدا کے خلاف بغاوت قرار پا جاتی تھی۔

قرآن نے کہا کہ خدا کی حکومت، خدا کی کتاب (یعنی قرآن کریم) کے ذریعے قائم ہوگی جس میں کسی انسان کا کوئی دخل نہیں ہوگا، کیونکہ خدا اپنے اختیارات کسی کو تفویض نہیں کیا | اس کا عملی ذریعہ کتاب اللہ کی حاکمیت ہے | قرآن۔ اس حقیقت کی وضاحت کے لئے خود زبان نبویؐ



سے کہلایا گیا کہ اَفْعَيْزَ اللّٰہِ اَتَّبِعْنِ حَکْمًا وَهَؤُلَاءِ سِیْ اَمْسُوْلَ اَیْنُکُمْ اَلْکِتَابَ مَفْضَلًا۔ (۱۰۷) ”کیا تم لوگ چاہتے ہو کہ میں خدا کے سوا کسی اور حاکم کی طلب و جستجو کروں، حالانکہ اس نے اپنی کتاب نازل کر دی ہے جو مفصل ہے۔“ یہاں سے دو باتیں واضح ہو گئیں۔ ایک یہ کہ تمہارا یہی اس لئے وجود میں آئی تھی کہ خدا کی کوئی ایسی کتاب موجود نہیں تھی جو ضابطہ زندگی بن سکتی۔ اس لئے جب خدا کی حکومت کا اصول تسلیم کر لیا جاتا تھا تو اس کے بعد لوگوں کو لازماً مذہبی و پیشوائیت کی طرف رجوع کرنا پڑتا تھا۔ دوسرے یہ کہ اس حقیقت کا اعلان خود ذات رسالت کا ہی سے کرانے میں حکمت یہ تھی کہ دنیا میں اگر کوئی انسان خدا کا نمائندہ بن سکتا تھا تو اس کا اولین حق بہر حال رسول اللہ کو پہنچتا تھا جب حضورؐ نے بھی یہ فرما دیا کہ خدا کی حکومت کے معنی اس کی کتاب کی حکومت ہے تو انسانی نمائندگی یا خدائی اختیارات کی تفویض کا نظریہ خود بخود باطل قرار دیا گیا۔ اس نظریہ کی رو سے حکومت خدا کی کتاب کے احکام و قوانین نافذ کرنے کی ایجنسی قرار پاگئی۔ اس سے زیادہ اس کی کوئی حیثیت نہ رہی۔ اس نظریہ کی صداقت کا تسلیم کر لینا ایمان قرار پایا اور اس سے انکار کفر و بدعت ماننا ہے۔

وَمَنْ لَّمْ یُحْکَمْ بِمَا اَنْزَلَ اللّٰہُ فَاُولَٰئِکَ هُمُ الْکَافِرُوْنَ ہ (۱۰۸)

جو لوگ کتاب اللہ کے مطابق حکومت قائم نہیں کرتے، وہی کافر ہیں۔

اور اس کے ساتھ ہی رسول اللہؐ سے فرما دیا گیا کہ۔ وَ اِنْ اَحْکَمْتُمْ بَیْنَهُمْ بِمَا اَنْزَلَ اللّٰہُ۔ (۱۰۹) ”ان میں کتاب اللہ کے مطابق فیصلے کرو۔“ گویا یہاں پھر دہرا دیا کہ یہ حکومت تمہارا یہی نہیں ہوگی۔ یہ کتاب اللہ کی حکومت ہوگی۔ قرآن کریم نے خدا کے سوا ہر انتہائی کو طاعت کہہ کر پکارا ہے اور کفر اور ایمان کے اس فرق کو ان الفاظ میں بیان کر دیا ہے کہ فَتَحٰ یُکْفِرُ بِالْاِطَاعُوْنَ وَ یُؤْمِنُ بِاللّٰہِ فَقَدْ اَسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰی لَا اِنْفِصَامَ لَهَا۔ (۱۱۰) ”مجھ خدا پر ایمان لایا اور اس نے طاعت سے کفر بڑھاتا تو اس نے ایسا حکم سررشتہ تھام لیا جو کبھی ٹوٹ نہیں سکتا۔“ اور اس ”کفر بالاطاعت“ کی تشریح ان الفاظ سے کر دی کہ ”کیا تم نے ان لوگوں کی حالت پر بھی غور کیا جو یہ عم خویش سمجھتے ہیں کہ ہم کتاب اللہ پر ایمان لے آئے ہیں۔ لیکن عملاً ان کی حالت یہ ہے کہ وہ چاہتے ہیں کہ اَنْ یَّیْتَنَّا کَمُؤَدِّیِ الْاِطَاعُوْنَ (۱۱۱) ”ہم نے معاملات کے فیصلے طاعت سے کر لیں حالانکہ انہیں حکم یہ دیا گیا تھا کہ وہ طاعت سے کفر بڑھیں۔“ یہاں سے بات بالکل واضح ہو گئی کہ خدا پر ایمان سے عملاً مفہوم یہ ہے کہ حکومت کے لئے اس کی کتاب کو اختیار لی تسلیم کیا جائے۔ اگر اس کے سوا کوئی اور اختیار لی تسلیم کر لی گئی تو یہ کفر ہوگا۔ اس کتاب کے متعلق ہم پہلے دیکھ چکے ہیں کہ اسے مفصل کہا گیا ہے۔ دوسری جگہ ہے۔ وَ تَحْمِلُ کُلُّ مَلَاَئِکَۃٍ حِمْلًا قَاوِمًا لَّا لَآ مُبَدِّلَ لَیْکَ لَمَّا تَیْمَنَیْنٰ۔ (۱۱۲) ”خدا کے کلمات (قوانین خداوندی) صدق و عدل کے ساتھ مکمل ہوں گے۔ یہ قوانین غیر متبدل ہیں۔“ بالفاظ دیگر یہ ضابطہ خداوندی مفصل، مکمل اور غیر متبدل ہے۔ اس کے ساتھ ہی ہمیشہ کے لئے محفوظ بھی۔ (۱۱۳)۔

یہی جس قسم کے ضابطہ حیات کی منظر میں مغرب کو تلاش تھی لیکن وہ انہیں کہیں سے ملتا نہیں تھا، وہ سامنے آ گیا۔ جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں، منکرین مغرب اپنے عقلی و تجرباتی طریق سے اس نتیجہ تک تو پہنچ سکے ہیں کہ اسی قسم کا ضابطہ اور نظام انسانی مشکلات کا حل پیش کر سکتا ہے لیکن انہیں اس کا سراغ نہیں ملا کہ وہ ضابطہ لے گا کہاں سے؟ اگر ان کے سامنے قرآن اپنی حقیقی شکل میں آجائے تو وہ یقیناً اسے لپک کر اٹھالیں۔ اس کے راستے میں رکاوٹ

کیا ہے اسے میں ذرا آگے چل کر بیان کر دوں گا جو کچھ میں نے اس وقت تک کہا ہے اس سے یہ حقیقت ہمارے سامنے آجاتی ہے کہ مسلمانوں کے نزدیک خدا کی کتاب کے تابع زندگی بسر کرنا ہی آزادی ہے۔ اس میں یہ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ حکومت کس کے ہاتھوں قائم ہوتی ہے۔ اگر حکومت خدا کی کتاب کی نہیں تو یہ آزادی نہیں، غلطی ہے، خواہ اس مملکت میں اقتدار خود اپنی قوم کے ہاتھوں میں ہی کیوں نہ ہو۔ انسانوں کو آزادی صرف کتاب اللہ کے تابع رہنے سے مل سکتی ہے۔ ارشاد ہے: **لَا يَكُنِ الْإِسْلَامُ فِي أَيْدِي النَّاسِ أَنِ احْبَبُوا إِلَهُهُمُ الْإِسْلَامُ فِي أَيْدِي النَّاسِ**۔ اہل کتاب ہوں یا مسٹر کین، کہے باشند، انہیں کبھی آزادی نصیب نہیں ہو سکتی تھی ناؤ تھیکہ ان کے پاس واقع حقیقت نہ آ جاتی — یعنی اللہ کا رسول نہایت پاکیزہ مصالحت لے کر — **رَفِئَهَا كُتُبٌ قِيَمَةٌ**۔ (پیش) وہ صحیفہ آسمانی جس میں نہایت حکم قوانین ہیں۔ "نور انسان کو حقیقی آزادی اس کتاب کی اطاعت سے مل سکتی تھی۔ اسی سے انسانوں کی حکومت کی وہ زنجیری ٹوٹ سکتی تھیں جن میں نور انسان جکڑی چلی آ رہی تھی اور اسی سے وہ بوجھل سہلیں ان کے سر سے اتر سکتی تھیں جن کے بوجھ تلے وہ اس بُری طرح دبی ہوئی تھی۔ (۱۰/۱۱)

پہلے بتایا جا چکا ہے کہ اسلام میں حکومت، قرآنی احکام و اقدار کے نفاذ کی ایجنسی ہے۔ بالفاظ دیگر اسے قانون سازی کا اختیار نہیں ہوتا۔ اس کا منصب قوانین خداوندی کا نفاذ ہوتا ہے۔ اس اعتبار سے اس کی حیثیت صرف اجرائیہ یا انتظامیہ کی رہ جاتی ہے۔ قرآنی اصطلاح میں اسے "استخلاف فی الارض" کہا جاتا ہے۔ یہیں سے لفظ خلیفہ ہے۔ (ضمنی) یہ جو ہمارے ہاں عام طور پر کہا جاتا ہے کہ خدا نے آدم کو اپنا خلیفہ بنایا تو یہ تصور غیر قرآنی ہے۔ قرآن میں کہیں نہیں آیا کہ خدا نے آدم کو اپنا خلیفہ بنایا ہے۔ یہ عیسائیت کا تصور ہے جس کی مدد سے یہ عقیدہ وضع کیا گیا کہ خدا نے اپنے اختیارات اپنے نمائندوں (کلیسا) کو تفویض کر دیئے ہیں۔ اس نکتہ کی وضاحت پہلے ہی کی جا چکی ہے۔ (سی تصور سے متاثر تھادہ ذہن جس نے ایک دفعہ حضرت صدیق اکبرؓ کو خلیفہ اللہ کہہ کر پکا باتو اپنے اسے سختی سے روک دیا اور فرمایا کہ خدا کا خلیفہ کوئی نہیں ہو سکتا۔ میں خلیفۃ الرسولؐ (یعنی رسول کا جانشین) ہوں۔ اور حضرت عمرؓ نے اتنے سے التباس کے امکان کو بھی حتم کرنے کے لئے خلیفہ کے بجائے امیر المؤمنین کا لقب اختیار فرمایا۔

بہر حال بات "استخلاف فی الارض" کی جو وہی تھی جس سے مراد ہے وہ نظام حکومت جس کی اُرد سے قرآنی احکام و اقدار کو نافذ کیا جائے نہ نہ قدیم میں حب ہونہ اقتدار کا مرکز شخصیتیں ہوتی تھیں اللہ تعالیٰ نے افراد کو خلیفہ کہہ کر پکارا۔ سورہ حق میں حضرت داؤدؑ کے متعلق ہے۔ **يَا دَاوُدُ إِنَّا جَعَلْنَاكَ خَلِيفَةً فِي الْأَرْضِ فَاحْكُم بَيْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ**۔ (۱۰/۱۱) لے داؤد! ہم نے تمہیں ملک میں خلیفہ بنالیا ہے سو تم لوگوں میں الحق (وحی خداوندی) کے مطابق حکومت قائم کرو۔ لیکن جب نور انسان اپنے بچپن کی منزل پس طے کر لینے کے بعد عالم شباب تک آ پہنچی تو شخصیتوں کا دور ختم ہو گیا اور عالمگیر انسانیت کے لئے وحی کی ماہنامائی میں اپنے معاملات آپ طے کرنے کا نیا دور شروع ہو گیا۔ تاریخ میں حضور رسالت مآبؐ اس دور کہیں کے اختتام اور عصر جدید کے آغاز کے نقطہ انصال پر فائز نظر آتے ہیں۔ ختم نبوت کا اعلان اسی انقلاب کی تمہید ہے۔ چنانچہ اس مقام پر پہنچ کر استخلاف فی الارض، اشخاص کے بجائے امتوں

کی طرف منتقل ہو گیا۔ کیا آپ نے اس پر کبھی غور فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت داؤدؑ کے متعلق تو فرمایا کہ **إِنَّا جَعَلْنَاكَ خَلِيفَةً فِي الْأَرْضِ**۔ لیکن حضور خاتم الانبیاءؐ کے زمانے میں کہا کہ **وَعَدَ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا مِنكُمْ وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْأَرْضِ** (پہلا)۔ ”تم میں سے جو لوگ وحی کی ابدی صداقتوں کو تسلیم کریں گے اور ان کے اعمال اس پیمانے پر پورے کریں گے تو انہیں استخلاف فی الارض عطا کیا جائے گا۔ یہ خدا کا وعدہ، یعنی اس کا غیر متبدل قانون ہے۔“ یعنی اب استخلاف فی الارض اشخاص کے بجائے امتوں کے حصے میں آئے گا۔ سوچئے عزیزان! کہ اس انقلاب عظیم کا اعلان آج سے چودہ سو سال پہلے اس زمانے میں ہوا جب ساری دنیا میں شخصی حکومتوں کا دورِ دودھ تھا اور افراد کی جگہ امتوں کی حکومتوں کا تصور تک کسی کے ذہن میں نہیں آ سکتا تھا۔ رد سو کا فلسفہ اور انقلاب فرانس تو ابھی کل کی بات ہے۔ قرآن کریم کے تجزیہ کردہ نظام کی رو سے استخلاف فی الارض، امت مسلمہ (یعنی امت محمدیہ) کے حصے میں آیا۔ اس امت سے کہہ دیا گیا کہ ان احکام و قوانین کی کارفرمائی کے لئے جو عملی پروگرام تجزیہ اور اختیار کیا جائے گا وہ بھی کسی ایک فرد کا طے کر دہ نہیں ہوگا۔ وہ تمہارے باہمی مشورے سے طے ہوگا۔ **وَأَمْرُهُمْ شُورَىٰ بَيْنَهُمْ**۔ (پہلا)۔ حتیٰ کہ اس نظام کے سربراہ اول جو بہر حال رسول اللہ ہی ہو سکتے تھے، سے بھی تاکید کر دی کہ **وَمَشَاوِرُهُمْ فِي الْأُمُورِ** (پہلا)۔ ”ملکت کے معاملات طے کرنے کے لئے افراد امت سے مشورہ کیا کرو۔“ ان احکامات کی رو سے، قرآن کریم نے ہر قسم کی شخصی حکومت — ملکیت یا آمریت — اور ان کے ساتھ ہی تھی ایک ایسی کاغذ کر دیا۔ پہلے بتایا جا چکا ہے کہ استخلاف فی الارض یعنی نظام حکومت مقصور بالذات نہیں تھا، ایک بلند مقصد کے حصول کا ذریعہ تھا۔ اور وہ بلند مقصد تھا، قرآنی اصول و اقدار اور احکام و قوانین کا نفاذ و اجراء۔ سورہ النور میں جہاں یہ کہا گیا ہے کہ ایمان و اعمال صالحہ کے نتیجے میں تمہیں استخلاف فی الارض، حاصل ہوگا، اس کے ساتھ ہی اس کی بھی وضاحت کر دی کہ یہ استخلاف اس لئے دیا جائے گا۔ **وَلِيُكَلِّمَهُمْ وَلِيُذْهِقَهُمُ الْبُذْيَ الَّذِي أَمْرُهُمْ شُورَىٰ بَيْنَهُمْ**۔ (پہلا) تاکہ اس سے اس دین کا ممکن ہو جائے کہ وہ نظام زندگی قائم اور (ESTABLISH) ہو جائے جسے تمہارے لئے پسند کیا گیا ہے۔ ملکیت کے اس فریضہ کو دیگر مقامات میں ”امر بالمعروف و نہی عن المنکر“ کی جامع اصطلاح سے تعبیر کیا گیا ہے۔ یعنی ان امور کا نافذ کرنا جنہیں قرآن کی سند قبولیت حاصل ہو، اور ان سے لوگوں کو روکنا جو اس کے نزدیک ناپسندیدہ ہوں سورہ حج میں ہے۔

**أَمْرٌ بِالْمَعْرُوفِ وَنَهْيٌ عَنِ الْمُنْكَرِ** | **الَّذِينَ إِذَا مَنَّكَ اللَّهُ فِي الْأَرْضِ أَقَامُوا الصَّلَاةَ وَآتَوُا الزَّكَاةَ**  
**وَأَمْرٌ وَأَيُّهَا مَعْزُوفٌ وَكَهَؤُلَاءِ مِنَ الْمُنْكَرِ** (پہلا)

یہ وہ لوگ ہیں کہ جب انہیں ملک میں ممکن ہوگا تو قیامت صلوٰۃ اور اتانے زکوٰۃ ان کا فریضہ ہوگا اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر ان کے ممکن کا مقصد۔ اس میں تمام معاملات انجام کار خدائی پروگرام کی تکمیل کے لئے سرانجام پائیں گے۔

پھر دیکھو! دیا جائے کہ جو تک یہ ممکن فی الارض پوری کی پوری امت کو حاصل ہوگا نہ کہ کسی ایک فرد یا گروہ کو اس لئے امر بالمعروف و نہی عن المنکر، کا فریضہ بھی پوری کی پوری امت کا ہوگا نہ کہ کسی ایک گروہ کا۔ سورہ آل عمران میں ہے **مَنْ كَفَرَ** **تَعَيَّنَ أَهْلُهَا جَبَتْ لِلنَّاسِ ثَمَانُونَ مِائَةً** **وَمَنْ كَفَرَ** **تَعَيَّنَ مِائَةً** (پہلا)۔ ”تم بہترین امت

ہو جسے نوع انسان کی بہبود کے لئے پیدا کیا گیا ہے۔ تمہارا فریضہ امر بالمعروف و نہی من المنکر ہے۔ یہی اس امت سے کہا گیا اور یہی اس نظام کے سربراہ اقل حضور نبی اکرم سے (ﷺ)۔

متعدد مقامات پر اس کی بھی وضاحت کر دی کہ اس نظام میں امت شکر خود رسول اللہ کو بھی اس کا اختیار نہیں ہوگا کہ وہ خدا کی طرف سے عطا کردہ ضابطہ حیات (قرآن کریم) میں کسی قسم کا رد و بدل کر سکیں۔ مخالفین کہتے کہ ہم اس نظام میں شریک ہونے کے لئے تیار ہیں بشرطیکہ آپ اس ضابطہ میں کچھ تبدیلیاں کر دیں۔ اس کے جواب میں حضور ﷺ فرماتے کہ مَا يَكُونُ لِي أَنْ أُبَدِّلَهُ مِنْ تِلْقَاءِ نَفْسِي - یہ میرے جیسے اختیار ہی میں نہیں کہ میں اس میں اپنی طرف سے کوئی تبدیلی کر دوں۔ اِنْ أَتَيْتُمْ إِلَّا مَا لَكُمْ حَتَّى آخِذٌ - میں تو خود بھی اسی کا اتباع کرتا ہوں جو میری طرف وحی کیا جاتا ہے۔ اِنَّ اَخَافُ اِنْ عَصَيْتُ رَبِّيَ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيمٍ - (پڑھا) اگر میں بھی اس کی نافرمانی کر دوں تو اس کی سزا سے نہیں بچ سکتا۔

یہاں سے ایک اور اہم نکتہ ہمارے سامنے آتا ہے۔ ہم نے دیکھا ہے کہ رسول اللہ نے فرمایا کہ میں خود اسی ضابطہ قوانین خداوندی کا اتباع کرتا ہوں۔ اگر میں بھی اس کی خلاف ورزی کروں تو اس کے مواخذہ سے بچ نہیں سکتا۔ اس سے واضح ہے کہ اطاعت ضابطہ خداوندی (قرآن کریم) ہی کی ہے۔ اسلامی نظام مملکت اس کی اطاعت کرانے کی مشینری بن کر رہے۔ کسی انسان کو حق حکومت حاصل نہیں | ان تصریحات کے بعد ہم اس ارشاد خداوندی کو سامنے لاتے ہیں جو نظام حکومت اسلامی کی اساس و بنیاد اس موضوع پر حروف آخر اور

تمام نوع انسانی کے لئے حقیقی آزادی کا منشور (CHARTER) ہے۔ اسے غور سے سنئے۔ ارشاد ہے۔  
مَا كَانَ لِشَيْءٍ أَنْ يُوْتِيَ مِنَ اللَّهِ الْكِتَابَ وَالْحُكْمَ وَالنُّصُوْحَ لِيَقُولَ لِلنَّاسِ كُنُوا عِبَادًا لِّيَ مِثْلَ مَسْرِئِ اللَّهِ فَإِنْ كُنْتُمْ تَحِبُّونَ آيَاتِنَا بِمَا كُنْتُمْ تَعْلَمُونَ الْكِتَابَ وَبِمَا كُنْتُمْ تَدْعُونَ  
تَحَدُّثُ سُورَتِ - (۱۸)

کسی انسان کو اس کا حق نہیں پہنچتا۔ خواہ خدا اسے ضابطہ قوانین یا حکومت یا نبوت بھی کیوں نہ عطا کر دے کہ وہ لوگوں سے کہے کہ تم خدا کے نہیں، میرے محکوم بن جاؤ۔ اسے یہی کہنا چاہیے کہ تم اس کتاب کی اطاعت کے ذریعے جسے تم پڑھتے پڑھاتے اور سمجھتے سمجھاتے ہو۔ اللہ کے محکوم (ربانی) بن جاؤ۔

یہ آیتِ جلیلیہ اسلامی نظام حکومت کا دستورِ اساسی یا نوع انسان کے لئے "آزادی کا چارٹر" ہے۔ اس میں کہا یہ گیا ہے کہ اطاعت یا محکومیت کسی انسان (یا انسانوں کے گروہ) کی جائز نہیں۔ خواہ وہ اطاعت انسانوں کے وضع کردہ ضابطہ قوانین کی نہ ہو (کتاب)۔ خواہ انطا مہد کی ہو (حکم)۔ حلقہ نبی کی بھی نہیں (نبوت)۔ اسلامی نظام میں اطاعت اور محکومیت، کتاب اللہ کی ہوگی۔ وہ نظام جس کی خصوصیت یہ ہوگی کہ

کس و ہر جا سائل و محروم نیست عبد و مولا، حاکم و محکوم نیست

یہی تضاد مقصد جس کے لئے اس خطِ زمین کو حاصل کیا گیا تھا لیکن جو آج تک اس مقصد سے محروم ہے۔ یہاں ایک دن کے لئے بھی کتاب اللہ کی حکومت قائم نہیں ہوئی۔ لہذا، ہمیں وہ آزادی نصیب ہی نہیں ہوئی جس کی ضامن خدا کی یہ کتاب ہے اور جو ہر شرف انسانی ہے۔ قرائنی آزادی تو ایک طرف، یہاں تو مغرب کا نظام جمہوریت بھی اپنی حقیقی شکل میں



قائم نہیں ہو سکا۔ یہاں کسی نہ کسی رنگ میں آمریت ہی کا دور دورہ رہا جو غلامی کی بدترین صورت ہوتی ہے۔ ہماری مذہبی پیشہ روایت آمریت کے خلاف تو اعلان جنگ کرتی ہے لیکن مغربی جمہوریت کو عین مطابق اسلام قرار دیتی ہے جس میں اکثریت کے فیصلوں کو برحق تسلیم کیا جاتا ہے۔

پاکستان میں اقامت میں کے سب سے بڑے مدعی حق اسلامی کے بانی ابو اللہ علیہ السلام ہیں۔ وہ مطالبہ پاکستان کی مخالفت میں ایک دلیل یہ بھی دیا کرتے تھے کہ:

جو لوگ یہ گمان کرتے ہیں کہ اگر مسلم اکثریت کے علاقے ہندو اکثریت کے تسلط سے آزاد ہو جائیں اور یہاں جمہوری نظام قائم ہو جائے تو اس طرح حکومت الہی قائم ہو جائے گی۔ ان کا گمان غلط ہے۔ دراصل اس کے نتیجے میں جو کچھ حاصل ہو گا۔ وہ صرف مسلمانوں کی کافرانہ حکومت ہوگی بلکہ اس سے بھی زیادہ قابل نفرت مسلمان اور موجودہ سیاسی شکست حقہ سوم۔ (ص ۱۳)

**اکثریت کا نظام** | پاکستان میں اگر انہوں نے (صدر ایوب کے دور کے انتخابات کے زمانے میں) اپنے اس مسلک کا اظہار فرمایا کہ:

اگر ایک ہندو جمہوری نظام کی حمایت کرتا ہے تو اسے میری تائید حاصل ہوگی۔ اس لئے کہ اس نے یہ اصول تسلیم کر لیا ہے کہ ملک کا نظام اکثریت کے نظریہ کے مطابق ہونا چاہیئے۔ (امر روز مؤرخہ ۲۰ اگست ۱۹۵۳ء)

آج بھی ہمیں خود وہی صاحب نے دین کے معاملے میں بھی اکثریت کے اصول کو حق کا معیار قرار دے دیا۔ انہوں نے کہا ہے کہ: اگر شریعت کو ملک کا دستور اور آئین بنانا ہے (جس سے کوئی مسلمان انکار کی جرأت نہیں کر سکتا) تو جمہوریت کے مسلم قاعدہ کے مطابق یہاں شریعت کی وہی تعبیر دستور اور آئین کی شکل اختیار کرے گی جسے مسلمانوں کی عظیم اکثریت معتبر مانتی ہے اب یہ ظاہر ہے کہ اس ملک میں مسلمانوں کی عظیم اکثریت حنفی ہے۔۔۔ لہذا اس کا قانون حنفی تعبیر شریعت پر مبنی ہو گا۔ (ترجمان القرآن، بابت جون - جولائی ۱۹۵۷ء)

چنانچہ اب ملک میں حنفی فقہ پبلک لازماً حیثیت سے نافذ کی جا رہی ہے۔ جیسا کہ میں متعدد بار واضح کر چکا ہوں، میرا تعلق کسی نہ یہی فرقے سے نہیں۔ اس لئے میں نہ کسی فرقہ کی نقد کے حق میں ہوں نہ کسی فرقہ کی نقد کے خلاف۔ میں تو قرآن مجید کا طالب علم ہوں اور میرا فریضہ یہ ہے کہ ہر پیش آمدہ معاملے کے متعلق یہ واضح کر دوں کہ اس کی بابت قرآن مجید کا کیا فیصلہ ہے۔ قرآن مجید کی مدد سے اکثریت یا اقلیت کے معیار حق و باطل قرار پانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اکثریت کے متعلق تو وہ واضح الفاظ میں کہتا ہے۔

وَإِنْ تَطِيعُوا أَمْرًا مِّنَ الْأَمْرِ يُضِلُّوكُمْ عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ إِنَّ يَتَّبِعُونَ إِلَّا الظَّنَّ وَإِنْ هُمْ إِلَّا يَخْرُصُونَ (پہر)

اگر تو دنیا کے باشندوں کی اکثریت کی اطاعت کر لے لگ جائے گا تو وہ تجھے اللہ کے راستے سے گمراہ کر دیں گے۔ وہ محض ظن و تخمین کا اتباع کرتے ہیں اور قیاس آدمیوں سے کام لیتے رہتے ہیں۔

اور تو اور خود خود وہی صاحب بھی اس حقیقت کو تسلیم کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ:

اسلام تعداد کی اکثریت کو حق کا معیار تسلیم نہیں کرتا۔ اسلام کے نزدیک یہ ممکن ہے کہ ایک ایسے شخص کی رائے پر ہی مجلس کے مقابلے میں برحق ہو اور اگر ایسا ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ حق کو اس لئے چھوڑ دیا جائے کہ

ص۔ یعنی مغربی جمہوریت کا مسلم قاعدہ دین میں حق و باطل کا معیار قرار دیا جا رہا ہے، (استغفر اللہ)



اس کی تائید میں ایک جہم فقیر نہیں۔ (اسلام کا نظریہ سیاسی - ص ۴۵-۴۶)

بہذا کسی عقیدہ، نظریہ یا مسلک کے متعلق یہ کہنا کہ چونکہ اکثریت اس کے حق میں ہے اس لئے وہ برحق ہے مغرب کے نظام جمہوریت کے تو مطابق ہے لیکن قرآن کریم کے یکسر خلاف۔ کیا یہ مقام حیرت نہیں کہ مغرب کے مفکرین تو اس اصول کو باطل قرار دے رہے ہیں اور ہمارے ہاں کے مدعیان اقامت دین اسے حق کا معیار بتا رہے ہیں؟ مغرب کا مشہور مفکر برتا اس باب میں لکھتا ہے:-

ایک انسان کا دوسرے انسان پر اقتدار و اختیار خواہ وہ کسی رنگ میں ہو استبداد ہے۔ قوت کسی شکل میں ہو اس کے یہی نتائج ہوں گے۔ وہ جاہ و منصب کی ہو یا پنجو فولاد کی۔ دولت کی ہو یا ذہنی برتری کی۔ کسی انفر کی ہو یا حاکم کی۔ کسی پادری کی ہو یا پردہت کی۔ قوت بہر حال قوت ہے اور تباد کی جڑ۔ اس کا لازمی نتیجہ ظلم اور بیداد گری ہوتا ہے۔ ان سب میں سب سے زیادہ خراب قوت وہ ہے جو اکثریت محض اپنا تباد کے مدور پر اقلیت کے خلاف استعمال کرتی ہے۔

۲۴۲ (THE MAKING OF HUMANITY)

مذہب قریم کا ایک ارشاد ہے جس پر غور کرنے سے ایک مسلمان کپکپا اٹھتا ہے۔ وہ ارشاد یہ ہے:-  
وَمَا يَكُونُ الْكُفْرُ بِاللَّهِ إِلَّا وَهُمْ مُّقْتَصِرُونَ (۲۴۱)  
ایمان کا دعویٰ کرنے والوں میں سے اکثر کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ وہ اس دعوے کے باوجود مشرک کے مشرک ہی رہتے ہیں۔

میں نہ کسی کے خلاف کفر کا فتویٰ صادر کیا کرتا ہوں نہ کسی کو مشرک قرار دیا کرتا۔ میں اس قسم کی جزاات کے خلاف خدا کی پناہ مانگتا ہوں۔ لیکن قرآن کریم جن امور کو مشرک قرار دیتا ہے ان کی وضاحت فریضہ خداوندی سمجھتا ہوں۔ سوال یہ ہے کہ وہ کون سی ایسی بنیادی گمراہی ہے جس سے انسان دعوئے ایمان کے باوجود مشرک کا مشرک رہتا ہے؟ اس کی وضاحت قرآن کریم نے خود ہی کر دی۔ سورہ الزمر میں ہے:-

وَإِذَا ذُكِرَ اللَّهُ وَحْدَهُ اشْمَأَزَّتْ قُلُوبُ الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِالْآخِرَةِ وَإِذَا ذُكِرَ الَّذِينَ مِنْ دُونِهِ إِذَا هُمْ يَسْتَبْشِرُونَ (۲۴۲)

جب خالصتاً خدا کے قانون کی بات کی جاتی ہے تو جو لوگ آخرت کے منکر ہیں انہیں یہ بات سخت ناگوار گزرتی ہے۔ لیکن جب اس کے ساتھ ادوروں کو بھی ملا دیا جائے تو وہ بہت خوش ہو جاتے ہیں۔

اس کی وضاحت اس سے اگلی سورہ میں ان الفاظ میں کر دی کہ:-

ذُكِرَ بِآيَاتِهِ أَنْ يَرْبِي اللَّهُ وَحْدَهُ كُفْرْتُمْ وَأَنْ يُشْرَكَ بِهِ تَوَفُّؤُنَا فَأَنْتُمْ لِلَّهِ الْعَلِيِّ الْكَلِيمِ (۲۴۳)

تمہارا یہ انجام اس لئے ہو کہ جب تمہیں خالصتاً خدا کی طرف بلایا جاتا تھا تو تم اس سے انکار کرتے تھے لیکن جب اس کے ساتھ انسانوں کو ملا دیا جاتا تھا تو تم ایمان لے آیا کرتے تھے۔ حالانکہ حقیقت یہ تھی کہ خفی حکومت



تمام زمانہ و مکاوی فیود سے آباد اگر کوئی ہے تو وہ صرف خداوند عالم ہے جس کے پاس حقیقی علم ہے اور جس کے علم میں زمانہ کے تغیرات سے ذرہ برابر کوئی تفسیر واقع نہیں ہوتا۔ (تنقیحات ص ۱۳)

لیکن مصیبت یہ ہے کہ یہ حضرات کہتے کچھ ہیں اور کرتے کچھ ایساں فقہی قوانین کو شریعت خداوندی کہہ کر نافذ کیا جا رہا ہے ظاہر ہے کہ یہ فقہ خدا کی نہیں، انسانوں کی وضع کردہ ہے۔ پھر ان فقہی قوانین پر اسلامی نظریاتی کونسل کے ارکان نے غور و فکر کیا۔ یہ بھی بہر حال انسان ہیں۔ لیکن دیکھئے کہ انسانوں کے ان مرتب کردہ قوانین کے متعلق کیا کیا جا رہا ہے؟ مودودی صاحب اپنے ان قوانین کے سلسلہ میں ایک انٹرویو میں کہا کہ اب ہماری فریضہ یہ ہے کہ عوام الناس کو یہ احساس دلائیں کہ اب یہاں خدا کا قانون جاری کیا جا رہا ہے۔

(ترجمان القرآن - بابت اپریل ۱۹۶۹ء ص ۱۳)

استغفر اللہ، ہمارے بار استغفر اللہ۔ انسانوں کے مرتب کردہ قوانین کو خدا کا قانون کہنا ایسا شرک ہی ہے جس کی جسارت ہم جیسے گنہگاروں کے توجہ تصور میں بھی نہیں آسکتی! اس قسم کی جسارت تو آخرتقر نے بھی نہیں کی تھی مان میں سے کسی نے بھی اپنی فقہ کو "قانون خداوندی" کہہ کر نہیں پکارا تھا۔ انہوں نے یہی کہا تھا کہ یہ ان کے اپنے مرتب کردہ قوانین ہیں۔ لہذا جو قوانین یہاں نافذ کئے جا رہے ہیں وہ حکومت پاکستان کے قوانین ہیں۔ قوانین خداوندی نہیں ہیں۔ قوانین خداوندی تو خدا کی کتاب میں ہوتے ہیں (اور ہیں)۔ قرآن کریم نے اہل کتاب کے متعلق کہا تھا کہ ان کی کیفیت یہ ہے کہ: یُکَلِّمُونَ الْکِتَابَ بِأَسَدٍ یُھِمْ ثُمَّ یَقُولُونَ هَذَا مِنْ عِندِ اللّٰهِ لَیْسَ شَرٌّ لَّآیْمٍہِمْ تَمَنَّا قَلِیْلًا..... (ہٹ)۔ یہ خود قوانین وضع کرتے ہیں اور انہیں قوانین خداوندی کہہ کر مشہور کرتے ہیں اور مقصد اس سے یہ ہوتا ہے کہ کچھ مفاد حاصل کر لئے جائیں، سوچئے کہ کیا یہاں بھی بعینہ یہی کچھ نہیں ہو رہا۔

اس سے بھی آگے بڑھئے۔ ان قوانین کے نفاذ پر مودودی صاحب نے ایک بڑا اہم اعلان فرمایا تھا جو ان کی جہالت کے ترجمان "ایشیا" بابت گیارہ فروری ۱۹۶۹ء کے صفحہ نمبر ۱ پر شائع ہوا تھا۔ اس میں انہوں نے ان قوانین کی اہمیت بتاتے ہوئے کہا تھا:-

انسانی قوانین کی خلاف ورزی کرنا اور چیز ہے اور خدا تعالیٰ اور رسول کے مت انوں کو توڑنا بالکل ہی دوسری چیز ہے۔ اس سے تو آدمی کا ایمان خطرے میں پڑ جاتا ہے اور وہ خدا کے غضب کا مستحق بن جاتا ہے۔

سیکولر نظام حکومت میں انسانوں کے وضع کردہ قوانین کی اطاعت اختیار کی جاتی ہے، لیکن ان کی خلاف ورزی سے صرف منراہنگنتی پڑتی ہے۔ اس سے نہ انسان کا ایمان خطرے میں پڑتا ہے اور نہ ہی مجرم خدا کے غضب کا مستحق قرار دیا جاتا ہے۔ لیکن یہاں یہ کیفیت ہے کہ قوانین تو انسانوں کے وضع کردہ ہی نافذ کئے جاتے ہیں، لیکن یہ کہا جاتا ہے کہ ان کی خلاف ورزی سے نہ صرف منراہی ملتی ہے بلکہ انسان کا ایمان بھی خطرے میں پڑ جاتا ہے اور اس پر خدا کا غضب بھی وارد ہوتا ہے۔

اسے کہتے ہیں تھیا کرسی جو انسانی غلامی کی شدید ترین اور بدترین شکل ہے اور جسے ختم کرنے کے لئے اقبالؒ اور قائد اعظمؒ نے مملکت پاکستان کو حاصل کیا تھا۔ انہوں نے بتا کر کہا تھا کہ اور کچھ ہو یا نہ ہو، پاکستان میں تھیا کرسی کو رائج نہیں ہونے دیا جائے گا جس میں مذہبی متضاد قوانین خداوندی

پیشوا اپنے قوانین کو تو انہیں خداوندی کہہ کر سواتے ہیں۔

اس سلسلے میں ایک اور نکتہ بھی قابل غور ہے۔ پاکستان میں فقہ حنفی کے ماننے والوں کی اکثریت ہے اس لئے یہاں وہ فقہ خدا کا قانون ہے۔ ایران میں فقہ جعفریہ کے ماننے والوں کی اکثریت ہے اس لئے وہاں وہ فقہ خدا کا قانون ہے یعنی مسلمانوں کی دوزخ و ملکوتوں میں دو ضوابط قوانین نافذ ہیں جو ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ لیکن (مودودی صاحب کے ارشاد کے مطابق) دونوں قانون خداوندی ہیں۔ سعودی عرب میں حنبلی فقہ (اسی اصول کے مطابق) خدا کا قانون ہے جو ان دونوں سے مختلف ہے۔ کل کو اگر مصر، مراکش، انڈونیشیا وغیرہ نے بھی اپنے ہاں فقہی قوانین نافذ کر لئے تو مالکی اور شافعی فقہیں بھی خدا کا قانون قرار پا جائیں گی جو ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ یہ ہے وہ اسلام جسے دنیا میں رائج کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے !

پاکستان میں شیعہ حضرات فقہ جعفری کے نفاذ کا مطالبہ کر رہے ہیں۔ اگر ان کا مطالبہ تسلیم کر لیا گیا تو یہاں دو فتوازی حکومتیں قائم ہو جائیں گی جن کا اپنا اپنا ضابطہ قوانین ہوگا اور یہ دونوں "خدا کے قوانین" کہلائیں گے۔ اگر ان کا یہ مطالبہ منظور نہ کیا گیا تو ظاہر ہے کہ شیعہ حضرات فقہ حنفی کی خلافت درزی کریں گے۔ اس سے دھڑکتے ہوئے کہ وہ قانون کے مطابق سزا کے مستوجب ہوں گے بلکہ (مودودی صاحب کے فیصلہ کی رو سے) ان کا ایمان بھی خطرے میں پڑ جائے گا اور وہ مورد غضب خداوندی بھی ہوں گے۔ اور اگر شیعوں نے اکثریت حاصل کر لی تو پھر حنفیوں کا ایمان خطرہ میں پڑ جائے گا اور یہ مضروب علیہ ہو جائیں گے۔ اس سے آپ یہ بھی دیکھیں کہ اس طرح خدا کا کس قسم کا تصور سامنے آتا ہے؟ یہ تصور کہ اس کی خوشنودی یا غضب کا کوئی مستقل معیار نہیں۔ یہ لوگوں کی کثرت اور قلت پر منحصر ہے۔ آج ایک گروہ کو اکثریت حاصل ہے تو وہ منعم علیہ ہے۔ کل کو وہ اقلیت میں آگیا تو اس پر خدا کا غضب وارد ہو گیا! اس سے خدا کا تصور (معاذ اللہ - صمد ہار معاذ اللہ) پارلیمان کے سپیکر کا سا سامنے آتا ہے جسے ہر اکثریت کو برحق قرار دینا پڑتا ہے۔ آج یہ اکثریت میں کل وہ اکثریت میں۔ آج یہ حق پر کل وہ حق پر!

آپ دیکھ رہے ہیں کہ یہاں مذہب کے نقاب میں کیا کھیل کھیلا جا رہا ہے؟ ہمارے نزدیک یہ کوئی اتفاقی حادثہ نہیں۔ یہ ایک سوچی سمجھی، پیلے سے طے شدہ اسکیم کا نتیجہ نظر آتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ دنیا کی کوئی مملکت — خواہ وہ برطانیہ، امریکہ اور بھارت کی نظام سرمایہ داری کی حامل ہو اور خواہ روس اور چین کی کمیونزم یا سوشلزم کی منبر دار — اسے برداشت ہی نہیں کر سکتی کہ مسلمانوں کی کسی مملکت میں قرآنی نظام رائج ہو جائے۔ اس سے ان کے نظام تباہ ہو جاتے ہیں۔ مطالبہ پاکستان کے زمانے میں اس کا بار بار اعلان کیا گیا تھا کہ ہم ایک آزاد مملکت کا قیام اس لئے چاہتے ہیں کہ اس میں قرآنی نظام رائج کیا جائے۔ یہ تمام ملکیتیں اس سے لڑنے پر آمادہ تھیں اور اسی بنا پر وہ تقسیم ہند کی مخالفت کرتی تھیں۔ لارڈ کر ومر نے بہت پیسے کہہ دیا تھا کہ :-

اگر مسلمان ممالک آزاد ہونا چاہیں تو ہم ان کو آزاد کر دیں گے۔ لیکن اگر وہ اپنی اسلامی حکومت قائم کرنا چاہیں تو ہم ہرگز یہ برداشت نہیں کریں گے۔ (برقہ دار ایشیا - مؤرخہ ۱۸ جولائی ۱۹۴۷ء)

تحریک پاکستان کے دوران ہندوؤں کے مشہور رہنما مشنری نے ہر ملکہا تھا کہ :-

تمہیں کچھ معلوم بھی ہے کہ پاکستان ہے کیا؟ نہیں معلوم تو میں لیجئے کہ پاکستان سے مراد یہ ہے کہ مسلمانوں کو

اس کا حق حاصل ہے کہ وہ ملک کے ایک یا ایک سے زیادہ علاقوں میں اپنے لئے ایسے مسکن بنالیں جہاں  
طرز حکومت قرآنی اصولوں کے سانچے میں ڈھل سکے (ٹریبیون - مؤرخہ ۲ نومبر ۱۹۴۱ء)

اور تو اور مسٹر گاندھی تک یہ کہہ رہے تھے کہ :-

اگر مذہب کو علی حالہ رہنے دیا جائے۔ یعنی ایک بچ کا معاملہ اور خدا اور بندے کے درمیان ایک ذاتی تعلق  
تو پھر ہندوؤں اور مسلمانوں کے کئی ایک اہم مشترک عناصر مکمل آئیں گے جو مجبور کر دیں گے کہ یہ دونوں ایک  
مشترکہ زندگی بسر کریں اور ان کی مداخلت بھی مشترک ہو۔ (ہندوستان ٹائمز مؤرخہ ۹ جون ۱۹۴۷ء)

قائم عظیم کی وفات پر ہندوؤں نے اندازہ لگایا تھا کہ اب پاکستان کی پوزیشن کمزور ہو گئی ہے اس لئے اس سے سمجھوتے  
کی شکل پیدا ہو سکتی ہے۔ اس سمجھوتے کے متعلق روزنامہ ہندوستان ٹائمز نے اپنی ۱۹ اکتوبر ۱۹۴۷ء کی اشاعت کے مقالہ  
افتتاحیہ میں لکھا تھا کہ :-

اگر پاکستان اسلامی اسٹیٹ کے خیال کو ترک کر دے اور اپنے سامنے ایک جمہوری سیاست کی تشکیل کا  
نصب العین رکھے تو اس سے پاکستان اور ہندوستان اور ہندوؤں اور مسلمانوں میں خوشگوار تعلقات کا  
ایک نیا دور شروع ہو جائے گا۔

ان تصورات سے واضح ہے کہ یہ ملکیت اسے برداشت ہی نہیں کر سکتیں تھیں کہ پاکستان قرآنی ملک بن جائے۔ جو جماعتیں  
مذہب کے نام پر تشکیل پاکستان کی مخالفت کر رہی تھیں وہ گزشتہ تیس سال سے پاکستان کے اندر رہتے ہوئے اس حد تک  
میں مصروف چلی آ رہی ہیں کہ یہ مملکت قرآنی نہ بننے پائے۔ تشکیل پاکستان کے بعد جس تیزی، شدت، کثرت اور وسعت  
سے "غیر اسلامی اسلام" اویں اس ملک اور ثانیا دیگر ممالک میں پھیلا گیا ہے اس کی مثال تاریخ میں نہیں ملتی۔ کیا آپ نے  
کبھی اس پر غور کیا ہے کہ اس کے بالآخر نتائج کیا ہیں ؟ اب ان کی یہ کوششیں باوجود ہورہی ہیں اور انہوں نے یہاں  
تھیا کر سی کو مسلط کرنا شروع کر دیا ہے یہ یاد رکھئے ؛ سیکولرزم کے مقابلہ میں اسلامی نظام کا قیام اتنا مشکل نہیں جتنا جتنا  
تھیا کر سی کے نظام میں مشکل ہوتا ہے سیکولرزم میں خدا کا انکار ہوتا ہے اس لئے مسلمان اسے ٹھنڈے پیٹوں قبول نہیں  
کرتے۔ تھیا کر سی میں اسی سیکولرزم کو خدا کا نام دے کر مسلط کیا جاتا ہے اس لئے عوام بہت جلد اس فریب میں آ جاتے  
ہیں اور پھر اس حال سے چھٹکارا مشکل ہو جاتا ہے۔

یہ ہے وہ مقام جہاں ہم آج کھڑے ہیں۔ ہمارے بے نصیبی کی مثال تاریخ میں شاید ہی کہیں مل سکے۔ ہم نے یہ مملکت  
حاصل کی تھی کہ ہم انسانوں کی غلامی سے نجات پا کر اور ایک خدا کی چوکھٹ پر سر جھکا کر ساری دنیا کے استغناء سے سرفراز  
آگے بڑھ جائیں۔ لیکن ہوا یہ کہ ہم انسانی غلامی کی ان زنجیروں میں جکڑے گئے جن سے زیادہ حکم گرفت کسی زنجیر کی  
نہیں ہو سکتی۔

خو اسٹم پیکل برآمد در جگر نشتر شکست

میں جانتا ہوں کہ یہاں مسلسل سازشوں سے ایسے حالات پیدا کر دیئے گئے ہیں کہ قرآن کریم کی آواز کسی کان تک  
پہنچنے نہ پائے۔ میں اس کے باوجود یہ آواز بلند کرتے جا رہا ہوں۔ مقصد اس سے یہ ہے کہ کم از کم آنے والا مؤرخ اس  
حقیقت کو اپنے سامنے بے نقاب پائے کہ ان تمام سازشوں اور سازشوں کے باوجود ایک گوشہ ایسا بھی تھا جہاں



سے یہ آواز مسلسل اور متواتر بلند ہو رہی تھی کہ :-

مَا كَانَ لِبَشَرٍ أَنْ يُفِيضَ إِلَهُهُ الْكِتَابَ وَالْحُكْمَ وَالشُّعْرَةَ لِيَقُولَ لِلنَّاسِ كُونُوا عِبَادًا لِّي مِنْ دُونِ اللَّهِ وَلَكِنْ كُونُوا رَبَّانِيِّينَ بِمَا كُنْتُمْ تُعَلِّمُونَ الْكِتَابَ وَبِمَا كُنْتُمْ تَدْرُسُونَ (۱۷)

کسی انسان کو اس کا حق حاصل نہیں — خواہ وہ مفتی ہو، خواہ حکمران، حتیٰ کہ وہ منصب نبوت پر بھی مقرر ہو۔  
یہ کہہ کر وہ لوگوں سے کہے کہ تم خدا کے نہیں بلکہ میرے حکوم اور ظام بن جاؤ۔ اسے یہی کہنا چاہیے کہ تم اس کتاب اور مذہب کی اطاعت سے جسے تم پڑھتے پڑھاتے ہو اور اپنی فکر کا مرکز بنا سکتے ہو فقط اللہ کے حکوم بن جاؤ۔

اس کا نام حقیقی آزادی ہے جس سے ہم محروم ہی نہیں پہلے سے بھی محروم ہو رہے ہیں۔

پیکار شمع! انسانوں کے پروانے کی آنکھوں سے  
سراپا درد ہوں، حسرت بھری ہے داستاں میری

❦

آخر میں سوال یہ ہے کہ ان حالات میں کیا کیا جائے۔ میں اس سوال کے جواب کو کسی خاص خطہ سرزمین تک محدود نہیں کہنا

**کیا کیا جائے؟** چاہتا اس لئے کہ جو کچھ میں نے اوپر عرض کیا ہے وہ پاکستان تک محدود نہیں۔ اس وقت مسئلہ

کے تمام ممالک میں صورت حالات کم و بیش یہی ہے۔ اس لئے میں اپنے جواب میں یہ

کہوں گا کہ جو مملکت بھی یہ چاہتی ہے کہ وہ ایک خدا کی حکومتی اختیار کرے، انسانوں کی ہر قسم کی حکومت سے آزادی حاصل کرے۔ خواہ اس حکومت کی شکل ملکیت ہو یا آمریت۔ تحقیق ایسی ہو یا عصر حاضر کا جمہوری نظام۔ اسے کرنا یہ ہوگا۔

۱۔ اپنے آئین میں اعلان کرے کہ مملکت میں اقتدار اعلیٰ قرآن مجید کو حاصل ہوگا۔

۲۔ مملکت کا فریضہ قرآنی احکام و قوانین، اصول و اقدار کو عملاً نافذ کرنا ہوگا۔

۳۔ یہ بات امت (مملکت کے مسلمان باشندوں) کے باہمی مشوروں سے طے کی جائے گی کہ ان اصول و قوانین کو

محالات موجودہ نافذ کرنے کا طریقہ کار کیا ہوگا۔ اس مشاورت کی مشینری خود تجویز کی جائے گی۔ اس مجلس مشاورت

کو آپ پارلیمان کہہ لیجئے۔ پارلیمان میں کوئی پارٹی نہیں ہوگی کہ قرآن کریم کی رو سے مذہبی فرقہ سازی یا پارٹی بازی

شرک ہے۔ پارلیمان کی رکنیت کے لئے بنیادی شرط قرآنی احکام و اقدار سے واقفیت ہوگی۔

۴۔ یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر پارلیمان میں اس بات پر اختلاف ہو جائے کہ جو کچھ طے کیا جا رہا ہے وہ قرآنی

تعلیم کے مطابق ہے یا نہیں؟ یا عام افراد و محاشدہ میں یہ خیال پیدا ہو کہ پارلیمان جو فیصلہ کر رہی ہے وہ قرآن کے مطابق

نہیں تو ایسی صورت میں کیا کیا جائے؟ میرے نزدیک اس کا حل یہ ہے کہ ملک کی عدالت عالیہ کے ارکان، ممتاز قانون دان

حضرات اور قرآن کریم پر گہری نگاہ رکھنے والے ارباب علم و بصیرت پر مشتمل ایک مجلس قائم کی جائے جس کے سامنے

اختلافی امور پیش ہوں۔ اس مجلس کے اراکین اس شرط سے مشروط ہوں کہ وہ کسی خاص مسلک کو نہیں بلکہ قرآن مجید

کو آخری سند و حجت تسلیم کرتے ہیں۔ وہ یہ طے کریں کہ قرآن کریم کے حکم کو عملاً نافذ کرنے کے لئے جو طریقہ کار تجویز کیا

جا رہا ہے وہ ممکن العمل ہے اور قرآن کے کسی اصول سے ٹکراتا نہیں۔

❦